بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٰہی کس سے بیاں ہو سکے ثنا اُس کی

کہ جس پہ ایسا تری ذاتِ خاص کا ہو پیار

جو تُو اُسے نہ بناتا تو سارے عالم کو

نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار

کہاں وہ رُتبہ کہاں عقلِ نارسا اپنی

کہاں وہ نورِ خدا اور کہاں یہ دیدۂ زار

چراغِ عقل ہے گُل اُس کے نور کے آگے

زباں کا مُنہ نہیں جو مدح میں کرے گفتار

اقتباس قصیدہ قاسمی بقلم نفیس ۱۴۰۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ ملیّہ فیصل آباد پاکستان

ہر اسلامی مہینے کے شروع میں شائع ہوتا ہے۔

جلد نمبر 8 — صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

بمطابق

شمارہ نمبر 2 — جنوری 2012ء

بیاد

حضرت مولانا انیس الرحمٰن لدھیانویؒ

خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائپوریؒ

بفیض

حضرت سید نفیس الحسینی

رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مضامین

مدیر اعلیٰ و سرپرست

ابن انیس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مدیر: حماد الرحمٰن لدھیانوی

نائب مدیر: جواد الرحمٰن لدھیانوی

فی شمارہ 25 روپے — پاکستان میں سالانہ 300 روپے

سالانہ بدل اشتراک بیرون ملک 45 امریکی ڈالر

رابطہ کے لیے

ماہنامہ ملیّہ — جامعہ ملیّہ اسلامیہ

محلہ خالصہ کالج P.O مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

041-8711569

0321-6611910

ناشر...... حبیب الرحمٰن لدھیانوی — مطبع: ظفر اینڈ فضل پرنٹنگ پریس فیصل آباد

Decl No. 3483-85

کلمۃ الحبیب

لمحۂ فکریہ

ابن انیس حبیب الرحمٰن لدھیانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰے

افواہوں کا بازار گرم ہے، سازشیں عروج پر پہنچ گئیں، افراتفری الاماں، نا اتفاقی کا دور دورہ ہے، مسائل لاینحل ہو چکے، کسی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اس ملک کے حالات کو سُدھار سکے، ہر شخص خوف کے عالم میں ہے، ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والی مسلح افواج اپنے تحفظ کے لئے جنگ لڑ رہی ہیں، حکومت اپنے خلاف سازشوں کا رونا رو رہی ہے، عدلیہ کی سننے والا کوئی نہیں، الزام تراشی کا سیلاب رُکنے کو نہیں آرہا، سیاستدان اپنی باری لینے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں، بجلی غائب، گیس نایاب، مہنگائی خودکشی اور عزتیں بیچنے پر اُکسا رہی ہے، نسلی ولسانی اور علاقائی عصبیت نئے صوبوں کو جنم دینے کے لئے مستعد ہے۔

دشمنانِ وطن و انسانیت موت ہاتھ میں لئے ہوئے کوچہ و بازار میں رقص کُناں ہیں، انسانیت نام کی چیز دم توڑتی ہوئی نظر آرہی ہے، مذہبی قوتیں آپس میں سر پھٹول میں مصروف عمل ہیں، مذہب کو گالی بنایا جا رہا ہے، حیاء و شرم کو بالائے طاق رکھ کر عریانی و فحاشی کو اپنا ورثہ قرار دیا جا رہا ہے، بے ننگ و نام لوگ افسر شاہی کی شکل میں براجمان ہیں، رشوت و بدعنوانی کو فیشن کے طور پر متعارف کرایا جا چکا ہے، قبضہ گروپ مضبوطی کی انتہا کو چُھو رہے ہیں، اصولوں سے باغی خود ساختہ مجتہدین کی یلغار ہے، تجدّد نواز اپنی عقلی خرافات کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ گھر گھر میں الحاد و زندقہ کا بیج بو رہے ہیں، نوجوان و خوبصورت حیا سے عاری فیشن کی دلدادہ عورتوں کے ہاتھوں میں قوم کی قسمت کے فیصلے دیدیئے گئے ہیں، ملکی وزارتوں اور غیر ملکی سفارتوں کو ناقص العقل صنف نازک کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے ہمارا وہ معاشرہ جس کی تشکیل میں ہم نے پینسٹھ سال لگا دیئے۔صدارت، وزارت، عدالت اور شجاعت آپس میں دست و گریباں ہیں۔کوئی نوٹس دے رہا ہے تو کوئی وصول کر رہا ہے،کوئی سنگ مرمر سے بنی ہوئی عمارت میں محبوس ہے تو کوئی اُسے نکالنے کی فکر میں ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کوئی ہماری سننے والا نہیں،کوئی ماننے والا نہیں،کوئی ہم پہ اعتماد کرنے والا نہیں، دنیا و جہان کے سارے عیوب ہم میں نکالے جا رہے ہیں،اسی لئے ملک کو توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہمارا ملک جس خطہ اُرضی پہ واقع ہے یہ نہ صرف دنیا کی بہترین جگہ ہے،نہ صرف زرخیز جگہ ہے،نہ صرف موسمی اعتبار سے آئیڈیل ہے،نہ صرف معدنی لحاظ سے مالا مال ہے، بلکہ جغرافیائی حیثیت سے اہم ترین ہے۔یہ ملک اس خطے کی ایسی راہداری ہے جو کئی ملکوں کی شہ رگ بن جاتا ہے،اس کے پڑوسی ممالک کی اس پر گہری نظر ہے۔اس کے پڑوس میں ایک سابقہ عالمی طاقت اس پر قبضہ کرنے کے خواب کی پاداش میں بکھر گئی،اور ایک دوسری اُبھرتی ہوئی عالمی طاقت اس پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔مگر ہم ہیں کہ کئی ہزار میل دور بیٹھی ہوئی طاقت کے سامنے سرنگوں چلے آ رہے ہیں،جبکہ ہمارے قریب ہی ایک مفلس و نادار مگر غیرت مند جنگجو قوم نے اس سے پہلے دو بڑی عالمی طاقتوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ انہیں اُدھیڑ کر اور بکھیر کر رکھ دیا۔

اس لئے کہ ان کے نزدیک جنگ حوصلے اور اللہ کی ذات پر یقین کامل کی بنیاد پر لڑی جاتی ہے۔ان لوگوں نے میدان بدر سے یہ سبق حاصل کیا ہے، جہاں پر صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ اور حوصلہ تھا اور مقابلے میں سامان حرب پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔یہاں بھی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں حوصلہ اور اللہ پر بھروسہ ہی کام آیا۔اب ایک اور تیسر طاقت جو کہ اپنے آپ کو دنیا کی واحد بڑی طاقت سمجھتی ہے نے جب یہاں پنجے گاڑنے کی کوشش کی اور اپنے تمام جدید سامان حرب کو ان جنگجوؤں پر کھول دیا اور سمجھا کہ یہ لوگ ڈر کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے،مگر چشم فلک آج دیکھ رہا ہے کہ وہی بڑی طاقت ان ہی بے سروسامان حوصلہ مند لوگوں سے محفوظ راستہ حاصل کرنے کے لئے گفت و شنید کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔

ہم لوگ انہی بے سروسامان لوگوں کو کچلنے کے لئے اس بڑی طاقت کے نہ صرف ہم نوا تھے

بلکہ اس کی جتنی ممکن ہو سکی مدد بھی کرتے رہے، مگر آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ جس طاقت کی ہم مدد کر رہے تھے اس نے مذاکرات میں ہمیں شامل کرنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس طاقت کو ہماری اوقات معلوم ہے، ہماری قیمت معلوم ہے۔ اسے معلوم ہے یہ لوگ آپس میں متحد نہیں۔ یہ لوگ خواہشات کے قیدی ہیں، ان کے ہاں ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں، ان کی فوج، حکومت، عدالت، سیاست آپس میں دست و گریباں ہیں۔

پرویز مشرف کے دور کو چھوڑیئے وہ تو ایک غیر عوامی شخص تھا، اس نے جو کیا سو کیا مسئلہ تو آجکل کی حکومت کا ہے جو کہ عوامی ووٹوں سے منتخب ہو کر آئی ہے، یہ لوگ کس ڈِگر پر چل رہے ہیں۔ یہ حکومت آجکل پارلیمنٹ کو بڑی اہمیت دے رہی ہے، عدلیہ اور فوج کے خلاف جب بھی بات کرنی ہو تو فوراً پارلیمنٹ کے سپریم ہونے کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی جتنی تذلیل انہوں نے کی ہے کسی اور نے نہیں۔

پارلیمنٹ میں کتنی ہی قراردادیں ملکی سلامتی کے نام سے پیش کی گئی ہیں ان کو بالائے طاق رکھ کر قومی سلامتی کو بیچ دیا گیا۔ ۲/مئی ۲۰۱۱ء کو جب امریکہ نے ایبٹ آباد میں اُسامہ کو مارنے کا ڈرامہ رچایا گیا تو ہمارے مقتدر حضرات نے پارلیمنٹ سے مشورہ کیئے بغیر بیان داغے اور واشنگٹن کے اخباروں میں اپنی تاریخی فتح کے مضامین لکھ دیئے۔ جب لوگوں نے شور مچایا تو پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا گیا اس میں اپنے موقف سے پھر گئے۔ پھر پارلیمنٹ نے ایک قرارداد پاس کی مگر اس کا حشر کیا ہوا؟

یہ سبھی جانتے ہیں۔ این آر او کو تو چھوڑیئے، آجکل ہماری حکومت کے گلے میں دو معاملے پڑے ہوئے ہیں، ایک تو ہماری فوج کے جوانوں کو نیٹو کی افواج نے فضائی حملہ کر کے شہید کر دیا ہے۔ اس موقع پر ایک مشترکہ فوجی، حکومتی اور عوامی ردعمل سامنے آیا جس کی وجہ سے افغانستان کے لئے نیٹو کی سپلائی بند کر دی گئی ہے۔ اس پر نیٹو کے ذمہ دار فکر مند تو ہیں ہی مگر ہمارے ہاں کے غیر ملکی مال پر چغالی کرنے والے سیخ پا ہیں، کیونکہ ان لوگوں کی روزی روٹی بند ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے کوشش ہو رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اس سپلائی لائن کو کھول دیا جائے، ابھی تک تو ان لوگوں کو کامیابی نہیں ہوئی، دیکھیں کہاں تک بات جاتی ہے۔

دوسرا معاملہ جو کہ ہمارے حکومتی اداروں کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے وہ ''میمو'' کیس کا

ہے۔ یہ ایک کہانی ہے جس میں ہماری ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق بتایا گیا ہے۔ ہماری حکومت کے ذمہ داران اگر شروع ہی سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ اس کہانی کے دو کردار ہیں، ایک منصور اعجاز دوسرا حسین حقانی، یہ دونوں کردار مشکوک ہیں۔ منصور اعجاز امریکی شہری ہے اور حسین حقانی امریکہ میں پاکستان کے سفیر ہیں جن سے فی الحال استعفیٰ لے لیا گیا ہے۔

معاملہ یوں ہوا کہ منصور اعجاز کے بقول کہ حسین حقانی نے مجھے یہ پیغامات دیئے کہ فوج سے ملک کے صدر زرداری کو خطرہ ہے اس لئے امریکہ کے جرنیل اس میں مداخلت کریں۔ اس پر یہ معاملہ سپریم کورٹ میں لے جایا گیا، اب ایک بینچ تشکیل دیا جا چکا ہے جو کہ اس معاملے کی تحقیق کر رہا ہے۔

عدالتی کمیشن اس کے متعلق کیا فیصلہ دیتا ہے یہ ابھی بعد کی بات ہے، ہم اس میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر ایک پاکستانی شہری ہونے کے ناتے یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ دال میں صرف کالا ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے منہ پر کالک ملنے کی ایک منظّم سازش کا حصہ ہے۔ جس میں قادیانی گروہ بھرپور طریقہ سے شریک ہے۔

جب سے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا ہے اسی وقت سے یہ گروہ اس ملک کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس گروہ کے پیچھے غیر ملکی طاقتیں اپنا کام دکھا رہی ہیں۔ منصور اعجاز قادیانی ہے اور امریکی شہری بھی ہے، وہ ایک بہت بڑی امریکی سرمایہ کار کمپنی حصہ دار ہے، جو کہ اربوں ڈالر کا بزنس کرتی ہے، اور اس کا خود یہ کہنا ہے کہ میری تمام تر وفاداری اور جانثاری امریکہ کے ساتھ ہے، ایسے حالات میں اس پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ قادیانی پاکستان پیپلز پارٹی کے جانی دشمن ہیں وہ پیپلز پارٹی کے اس جرم کو کبھی نہیں معاف کر سکتے جو ان کے نزدیک ۱۹۷۳ء میں اس نے قادیانیوں کو آئین میں غیر مسلم اقلیت قرار دے کر کیا ہے۔

میں بذات خود پیپلز پارٹی کا سخت مخالف ہوں، میں ان کی پالیسیوں سے بالکل متفق نہیں ہوں، میں نے اپنی ہر تحریر میں پیپلز پارٹی پر سخت تنقید کی ہے، مگر میمو کیس کے معاملہ میں ایک قادیانی کا یوں کُھل کر سامنے آ جانا شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔ جو لوگ ایک جھوٹے شخص کو نبی مانتے ہوں جن کا نبی ساری زندگی جھوٹ، دجل اور فریب کا پرچار کرتا رہا ہو اس کے ماننے والوں سے اس ملک کے لئے جس میں ان کو غیر مسلم قرار دیدیا گیا ہو کب خیر اور سچ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ قادیانیوں کی ہمیشہ کو

شش رہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے پاکستان کے آئین سے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کی شق نکال دی جائے ، بینظیر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے لبرل ظاہر کرتی رہی ،شنید ہے کہ اس پر قادیانیوں نے اس سلسلہ میں دباؤ ڈالا تھا مگر وہ عوامی ردعمل سے ڈرتی رہیں اس لئے وہ یہ کام نہ کر سکیں۔

بے نظیر کے قتل کے بعد اب جبکہ پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی اور آصف علی زرداری ملک کے صدر بنے اور انہوں نے اٹھارھویں ترمیم کے ذریعہ ملک کے آئین کو دوبارہ کھنگالا اور اس میں کئی شقوں میں تبدیلی کی تو اس وقت بھی قادیانیوں نے غیر ملکی طاقتوں کے ذریعہ دباؤ ڈلوایا مگر کامیابی اس لئے نہیں ہوئی کہ پاکستان غیر ملکی فوجوں کے ساتھ مل کر دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا، اس لئے غیر ملکی حکومتوں نے ترمیم پر زیادہ زور نہیں دیا۔ یہ خواہش ناکام ہونے کے بعد قادیانیوں نے ایک نیا جال پھینکا ہے۔اس میں غیر ملکی طاقتوں کی سرپرستی بھی شامل ہے۔

منصور اعجاز کے بااثر ہونے کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ایک مشہور صحافی سہیل وڑائچ نے ایک ٹی وی انٹرویوں میں بتایا کہ ’’۲۰۰۹ء میں برطانیہ میں بینظیر بھٹو نے مجھے بلایا جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ منصور اعجاز ملنے کے لئے آیا ہوا ہے، میں اس سے پوچھتی ہوں کہ اس کی موجودگی میں تم کو بھی بلالوں، تھوڑی دیر کے بعد بینظیر نے کہا کہ منصور اعجاز کسی دوسرے کی موجودگی میں بات کرنے پر راضی نہیں، چنانچہ پندرہ بیس منٹ منصور اعجاز اور بے نظیر کے درمیان علیحدگی میں ملاقات ہوئی، جب منصور اعجاز ملاقات کر کے چلا گیا اور مجھے بینظیر نے بلایا تو میں نے محسوس کیا کہ بے نظیر کے چہرے پر گہری پریشانی کے آثار تھے‘‘۔سہیل وڑائچ کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ منصور اعجاز کس قماش کا آدمی ہے اور اس کی پشت پناہی کون کر رہا ہے۔

میموکیس کو اہمیت کب اور کیوں حاصل ہوئی؟ دیکھنے اور سوچنے کی بات ہے۔ یہ قصہ اکتوبر ۲۰۱۱ء میں منصور اعجاز کے ایک مضمون سے شروع ہوا جو اس نے ایک غیر ملکی اخبار میں لکھا تھا۔اس پر پاکستان آئی ایس آئی کے ڈائیریکٹر جنرل شجاع پاشا صاحب منصور اعجاز سے ملنے کے لئے لندن گئے ،وہاں پر منصور اعجاز نے انہیں جو کہا انہوں نے من وعن تسلیم کر کے پاکستان میں رپورٹ دی، میڈیا میں شور مچ گیا، جو سیاستدان اور میڈیا کے لوگ حکومت کے مخالف تھے ان کے ہاتھ حکومت کو گرانے کا

بہانہ آ گیا۔سب سپریم کورٹ دوڑے،حکومت چونکہ پہلی ہی سے سپریم کورٹ کے احکامات پر عمل نہ کرکے سپریم کورٹ کو ناراض کرچکی تھی اس لئے سپریم کورٹ نے سخت ایکشن لے لیا۔کاروائی ابھی دھیمی ہی تھی کہ اچانک نیٹوں کی فوجوں نے افغانستان کی سرحد پر واقع سلالہ چیک پوسٹ پر ہوائی حملہ کر دیا جس سے پاکستان کے دو درجن فوجی شہید ہوگئے۔

اس پر پورے ملک میں شور اُٹھا،ساری قوم غیر ملکی فوجوں کے خلاف متحد اور یک جان ہوگئی۔جس کے نتیجہ میں پاکستان سے نیٹو کی سپلائی لائن کاٹ دی گئی،جو کہ ابھی تک کٹی ہوئی ہے۔اس پر نیٹو کی طرف سے کافی کوشش کی گئی کہ اس کو بحال کر دیا جائے مگر بات نہیں بنی،قوم کا غصہ بڑھ رہا تھا ،بات بیانات سے نکل کر جلسوں اور جلوسوں تک پہنچ گئی ،اور امریکہ دشمنی میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔چنانچہ تجربہ کار لوگوں نے میموکیس کو آگے بڑھا دیا،اس کو اتنا اُچھالا کہ اس چکر میں نیٹو فوج کے حملے کا معاملہ دب کر رہ گیا ہے۔اب شنید ہے کہ سپلائی چند شرائط کے ساتھ بحال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

منصور اعجاز اور حسین حقانی دونوں امریکی شہری ہیں،فرق صرف یہ ہے کہ منصور اعجاز پیدائشی امریکی ہے اور حسین حقانی نے پاکستانی شہریت کو لات مار کر امریکی شہریت حاصل کی،یہ دونوں امریکی ایجنٹ ہیں،دونوں کا مقصد بھی ایک ہی ہے،پہلے یہ دونوں ایک ہی تھے اب کسی مفاد کی خاطر لڑائی ہوگئی ،کل یہ دونوں پھر ایک ہوسکتے ہیں پھر ہم کیا کریں گے۔سپریم کورٹ کیا کرے گی،اور سپریم کورٹ جانے والے کیا کریں گے،منصور اعجاز کو پروٹوکول دینے والے اور اس پر پابندی لگانے والوں کی کیا حیثیت رہے گی۔میموگیٹ ایک سازش ہے جو بیرن ملک میں تیار کی گئی ہے،اس کا مقصد سپریم کورٹ اور فوج جیسے اداروں کو متنازع بنانا ہے،انہی دو اداروں کو غیر مؤثر بنانے کے لئے غیر ملکی طاقتیں بے تاب ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ منصور اعجاز اور حسین حقانی پاکستان کے لئے مخلص ہوں۔

حسین حقانی نے پاکستان میں ابتری پھیلانے کے لئے ریمنڈ ڈیوس جیسوں کو ویزے جاری کیئے،جس کی وجہ سے تقریباً پینتیس ہزار پاکستانی لقمۂ اجل بن گئے۔اور منصور اعجاز نے پاکستان کی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف مضامین لکھ کر دنیا کے سامنے انہیں دہشت گردوں کا سرپرست ثابت کرنے کی کوشش کی۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ رحمان ملک جیسے حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ منصور اعجاز کو پاکستان کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر کرکے اُسے پاکستان میں روک لیں گے، بھلا جولوگ ریمنڈ ڈیوس جیسے دو پاکستانیوں کے قاتل کو روک نہیں سکے وہ اس منصور اعجاز کو کیسے روک سکیں گے جو یہ کہتا پھرتا ہے کہ میرے پاس رحمٰن ملک کے غیر قانونی مالی معاملات کے شواہد ہیں۔
ہم یہ نہیں کہتے کہ حسین حقانی بہت پاک صاف ہے،اور ملک کا بڑا خیر خواہ ہے،نہیں ہرگز نہیں،اس کے لچھن بھی ایسے ہی تھے جن سے ملک تباہی کی طرف جانے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا تھا،وہ امریکہ میں پاکستان نہیں بلکہ امریکہ میں رہ کر امریکہ ہی کا سفیر تھا۔اب نوبت یہاں پہنچ چکی ہے کہ تحقیقات کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ تحقیقات ضرور ہوں،منصور اعجاز کے کرداراور اس کے سرپرستوں کو ضرور ٹٹولا جائے کہ اس کے پیچھے کیا سازش کارفرما ہے کہ اس نے پاکستانی فوج اور حکومت کو مقابلہ میں لا کھڑا کیا ہے،جس کی وجہ سے پورا ملک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہے۔حسین حقانی کو بھی قرار واقعی سزا دی جائے کہ اس کی وہ کونسی مجبوریاں تھیں جن کی بناپر اس نے ایک قادیانی ملک دشمن اور بین الاقوامی بلیک میلر سے تعلقات اس حد تک بڑھائے کہ اس کو خفیہ پیغام رسانی کا کام سرانجام دینا پڑا۔
تازہ خبروں کے مطابق منصور اعجاز نے سکیورٹی وجوہات کا بہانہ کرکے پاکستان آکر عدالتی کمیشن کے سامنے پیش ہونے سے انکار کردیا ہے۔لگتا ہے کہ کوئی مُک مُکا ہوگیا ہے۔میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ نیٹو کی سپلائی بند کرنے کی وجہ سے حکومت وقت کو دباؤ میں لانے کے لئے میمو کیس کو چڑھایا گیا،گذشتہ روز وزیراعظم نے اپنے ایک بیان میں نیٹو کی سپلائی مشروط طور پر بحال کرنے کا عندیہ دیدیا ہے،

اس لئے بات کو پانی میں مدھانی کی طرف لے جایا جارہا ہے،جس کی نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔یہاں پر ہرایک اپنی گردن بچانے کے عوض ملک بیچنے پر تُلا ہوا ہے،
لمحہ فکریہ ہے،اللہ خیر فرمائے۔

جو جس سے محبت کرتا ہے

اوریا مقبول جان

سیدالانبیاء، شافع روزِ جزا، خیرالامم، سرورعالم حضرت محمد ﷺ کے جشن ولادت کے ان ایام میں شہر درشہر آپ سے عشق ومحبت کے اظہار کی سرمستی چھائی ہوئی ہے۔ اسوۂ رسولؐ پر تقریریں ہیں، محافل میلا، درودوسلام، چراغاں اورریلیوں جلوسوں کا سماں ہے۔ یوں تو ان میں سے چندلوگ سارا سال کسی نہ کسی موقع پرآپ ﷺ کے ذکر کی کوئی نہ کوئی محفل ضرورسجائے رکھتے ہیں لیکن اکثراس سرمستی اورجشن کے ان چنددنوں کے بعددنیا کے معمولات میں گم ہوجاتے ہیں اوران روزمرہ کے دنوں میں نہ ہمارے کاروبار میں اخلاقیات ، نہ گھر اورنہ معاشرتی زندگی میں اس پیارے رسول ﷺ کی سیرت نمونہ رہے گی اورنہ ہی ہم انہیں گفتگو کی حدتک ہی اپنے لیے ایک آئیڈیل کے طورپر بتائیں گے۔ ہم کیسی امت کے فرد ہیں؟ ہم کیسے عاشقان رسول ہیں کہ سرکاردوعالم ﷺ کوہم متاعِ عزیز کہتے ہیں۔ ان کے لیے جان قربان کرنے کے دعوے ہماری زبانوں پر جاری رہتے ہیں لیکن ہماری تمام تر زندگیوں میں ہمارے رہنما، ہمارے آئیڈیل، ہمارے قائد کوئی اور ہیں۔ نہ ہم گھروں میں آپ کی طرح مثالی شوہر بننے کی کوشش کرتے ہیں اورنہ باپ۔ نہ کاروبار میں ہماری ترقی اورمعاملات میں آئیڈیل آپ ﷺ کی ذات ہے ہمارے ہمسایوں سے تعلق، ہمارا بوڑھوں، بچوں اورعورتوں سے حسنِ سلوک ویسا ہے اورنہ ہی ہم آپ کو معیار سمجھتے ہیں۔ ذاتی زندگی کی یہ جھلک جب ہماری اجتماعی سوچ میں نکھرتی ہے تو پھر ہمارے سیاسی، کاروباری اورمعاشرتی لیڈرسب کے سب مختلف ہوجاتے ہیں۔کوئی کہتا ہے میں فلاں قبرستان میں سوئے ہوئے لیڈر کا ویژن لے کرآگے بڑھوں گا اورموت کی پروانہیں کرونگا۔کسی کواپنے قائد تحریک کے خیالات سے رہنمائی میں دین ودنیا کی بھلائی نظرآتی ہے۔کوئی کسی کے عدم تشدد کے فلسفے کواپنا عقیدہ بنالیتا ہے اورکسی کواپنے قائد کی شکل میں ایسا مسیحا نظرآتا ہے جوملک کو ترقی کی شاہراہ پرگامزن کرے گا۔

سماجی کاموں میں کسی کا ہیروبل گیٹس ہے تو کوئی مدرٹریسا کے نقش قدم پرچلنا چاہتا ہے۔ ذاتی

زندگیوں میں فادرز ڈے والا باپ محبتوں کا مرکز ہے۔ کاروباری معاملات کے ہیرو تو ایسے ہیں کہ جن کے نزدیک کاروباری عمارت عوام کے خون پر تعمیر کی جاتی ہے۔ ہماری خالص مذہبی زندگی میں بھی سب کے سب اسلاف، پیر طریقت، مفتی اعظم، قائد ملت، خطیب پاکستان کے بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں اپنے لیے بت بنالئے ہیں۔ اتنے آئیڈیل تراش لیے ہیں، شخصیات کی اتنی بڑی بڑی دیواریں کھڑی کرلی ہیں کہ ہمیں ان دیواروں کے پار پیارے رسول ﷺ کی نہ شخصیت نظر آتی ہے اور نہ ہی ان کے اقوال کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم ان شخصیتوں کے خول میں اندھے، بہرے اور گونگے بن چکے ہیں اور لگتا ہے ہمارے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں کہ ہم زبان سے سیدالانبیاء کا ذکر بھی کرتے ہوں، ان پر درود وسلام بھی بھیجتے ہوں، ان کی محافل میلاد بھی مناتے ہوں لیکن ہمارے دلوں میں جو شخصیتوں کے بت آباد ہو چکے ہیں اس نے ان دلوں کو اتنا پراگندہ کردیا ہے کہ ان میں میرے رسول ﷺ کی شخصیت کی خوشبو بھی جھانکنا گوارا نہیں کرتی۔

سیدالانبیاء کی شخصیت کو خوشبو کی جھلک آپ ﷺ کی اس حدیث میں دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور لیڈر، رہنما یا قائد کی ضرورت ہے؟ کیا ہمارا دامن قیادت سے خالی ہے؟ کیا ہمیں کسی اور رہنما کے وژن کے مطابق ہماری زندگیاں بہتر ہوسکتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکر الٰہی میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لیے وجہ اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری غذا ہے، صدق میرا سفارشی ہے، اطاعت میرا اندوختہ ہے، جہاد میرا کردار ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

سیاست، کاروبار، نوکری، معاشرت، معیشت، خاندانی زندگی، عالمی تعلقات ان سب کو اپنی نظر میں رکھیے اور اس وژن کی کسوٹی پر پرکھیئے تو شاید آپ کو دنیا کے کسی لیڈر، کسی رہنما اور کسی قائد کی ضرورت باقی نہ رہے۔ میرے وہ دوست جو موجودہ ترقی کی بنیادوں میں انسانی عقل اور تگ ودو کو تلاش کرکے اس پر ملکوں کی ترقی کے ماڈل بناتے ہیں انہیں ان تمام اصولوں میں جو میرے رسولؐ نے فرمائے اپنے لیے کچھ اصول ضرور مل جائیں گے۔

جیسے عقل میرے دین کی اصل ہے یا علم میرا ہتھیار ہے لیکن میرے آقاؐ کے ان دو اصولوں کو

جب باقی اصولوں کے گلدستے سے جدا کر دیا جائے تو یہ دونوں پھول تو خوبصورت لگیں گے لیکن زندگی کا گلدستہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔سوچئے اعتماد جسے آپ ﷺ نے خزانہ کہا اگر وہ کسی قوم سے چھین لیا جائے تو وہ ایک عضو ناکارہ اور شرمندہ سی قوم بن کر رہ جاتی ہے۔جس قوم کے پاس حزن نہ ہو اور جو دوسروں کی مصیبتوں پر آنسو نہ بہا سکے وہ کس قدر ظالم ہو گی؟ جو قوم صبر کا لباس نہیں پہنتی تو اس کے اندر حرص وہوس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مال غصب کرنے لگتی ہے۔کیا خوبصورت اصول ہے کہ شوق میری سواری ہے۔اس قول کو دنیا کی خوبصورت شاعری بھی کہا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی۔کونسا ایسا مرحلہ ہے جو شوق کی سواری کے بغیر طے ہوتا ہے۔یقین کی دولت جس قوم کو میسر آجائے ، جسے اپنی صلاحیتوں پر، اپنے ماحول اور اپنی قوم پر یقین محکم ہو تو اس کی ترقی کی رفتار کو ایک مہمیز لگ جاتی ہے۔آپؐ نے فرمایا یقین میری غذا ہے یعنی جس کی وجہ سے اس قوم کا وجود پھلتا اور پھولتا ہے۔ عاجزی جسے آپؐ نے اپنا فخر کہا ہے یہ وہ متاع ہے، یہ وہ عظیم سرمایہ ہے جو آج ہم سے مفقود ہو چکا ہے۔ اکڑی ہوئی گردنیں اور تنے ہوئے سر ہم پر تھانے سے لے کر ایوان صدر تک حکومت کرتے ہیں۔ان تمام اصولوں کی بنیاد اور ان ساری کاوشوں کا مرکز و محور آپؐ نے اللہ کی رضا کو قرار دیا ہے لیکن ہم تو اپنی تمام تر جہد و جہد کو اپنی قیادت کے سامنے سرخرو ہونے کے نام کرتے ہیں اور ہماری قیادتیں عوام کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے یہ سب کرتی ہیں۔اللہ کی رضا مفقود ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم ذکر الٰہی کرتے ہیں لیکن یہ ذکر ہمارا مونس و غمخوار نہیں بنتا۔یہی وجہ ہے کہ ہم روز نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن یہ نماز ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں بنتی۔ ہمارا سہارا اللہ کی رضا نہیں بلکہ ان کاروباری، معاشرتی، معاشی اور سیاسی لیڈروں کی اطاعت میں گزرتا ہے ایسے میں نہ ذکر الٰہی ہمارا مونس ہے اور نہ ہی نماز ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک۔اب آخری منزل، آخری راستہ، آخری نجات کی راہ کہ اللہ ہمیں بچالے تو اسکے لیے میرے آقا ﷺ نے کہا کہ صدق سفارشی ہے۔کیا ہم ایک سچی قوم ہیں؟ کیا ہم ایک صدق پر عمل پیرا ملت ہیں ؟ ہمارا تو سفارش کرنے والا ہی ہمارے ساتھ نہیں تو ہم پر کرم کیسے کیا جائے گا......؟؟؟

کون کہتا ہے کہ ہمارے ہاں قیادت کا فقدان ہے۔قیادت تو ہمیں ایسی میسر ہے کہ تاریخ عالم میں کسی کو میسر نہیں لیکن ہمارے قائد تو اور ہیں، ہمارے رہنما تو اور ہیں۔ہم روز ان کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ صرف ایک حدیث پاک پر بات ختم کروں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا:

''آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبت کرتا ہے''۔

ہر کسی کو اپنا حشر سوچ لینا چاہیے

خالقِ کائنات نے مخلوقِ انسانی کو تخلیق کر کے ایسی ڈھب پر ڈھالہ اور اسکی حیات مستعار کو بایں انداز ترتیب دیا ہے کہ اس پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیات کا ورود ہوتا ہے کبھی بہجت وانبساط کی نشاط آگیں گھڑیاں در آتی ہیں اور اسے شاداں وفرحاں کر جاتی ہیں کبھی اندوہ وحرماں کے المناک لمحات وارد ہوتے ہیں اور اسے افسردہ وغمناک بنا دیتے ہیں۔ کبھی از حد بے چین و بے قرار ہونے لگتا ہے اور کبھی بے حساب پر سکون و مطمئن ہو جاتا ہے۔ کبھی قنوط و یاس تک کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے اور کبھی مایوسی وناامیدی سے یکسر منہ موڑ کر سراپا امید ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام حیات وہستی اور اسی کا نام زیست وزندگی ہے۔ اور یہی حیات وزیست ہے۔

اس دنیائے رنگ وبو میں طرح طرح کے حسن وجمال کے رنگ بکھیرتی اور یہی زندگی وہستی ہی فضاء وماحول کو قوس وقزح کے دھنکی جلترنگوں سے رنگ دیتی ہے۔ اگر یہ حیاتی سدا ایک ہی حالت میں رواں رہتی اور اس سے سرمدی میں کبھی عدم وفنائیت کی فنا کاری رونما نہ ہوتی۔ تو اس لاریب یہ ہستی مبدل بہ نہیں ہو کر زندگی کو بے کیف وسرور کر دیتی۔ ارتقاء وارتفاع کا عمل رک جاتا۔ ہر سو توقف وٹھراؤ کا دور دورہ ہوتا اور زمانے کا چلن جمود کا شکار ہو کر بحر مردار کا نقشہ پیش کرتا۔ جبکہ مدارج ومعارج کے لئے عمل ارتقاء لابدولازمی ٹھہرایا گیا ہے۔ اور ارتقاء ومسابقت میں ٹھہراؤ محض مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ بنا بریں بیتے لمحات کے ساتھ جہاں وقت کے دھارے بدلتے رہتے ہیں اور ایام رفتہ کی گذشت کاری اذکار ماضی کے عنوان سے سوہان روح وزندگی بن جاتی ہے۔ ان کیساتھ کیفیات کی کیف شعاریاں بھی مختلف رنگ دکھاتی ہیں کہ کبھی دردوں دکھوں کے تھپیڑے لگاتی ہیں۔ اور کبھی پیار وپریم کی پرکاریاں کرتی ہیں بقول شخصے

یاد ماضی عذاب ہے یارب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس وقت ایک ایسی اولوالعزم ہستی کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ جنکی کرشماتی و ہمہ جہتی شخصیت کا احاطہ محض کاردار ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ باوجودیکہ ان کے ساتھ چہار عشروں کا قلبی تعلق و نیازمندی رہی اور چہل سال تک کے طویل عرصے کو محیط انھیں قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ادب وانشاء ہو یا تمدن وتہذیب۔ ثقافت وعمرانیت ہو یا تصوف واحسان۔ مجھے ہمیشہ ان کے کلام گلفام وگفتار جی دار سے رہنمائی ملی اور عمل وکردار سے ایسی رہبری نصیب ہوئی جو زندگی بھر حرز جان بنکر مشعل راہ رہی اور ظلمت شب دراز میں صبح فردا کی نوید دیتی رہی۔ مژدہ جانفزا سناتی رہی۔

میں نے ان سے بیعت نہیں کی اور نہ ہی اس کا خیال آیا۔ لیکن ان سے عقیدت عشق ودیوانگی کی حدتک کی۔ احترام واکرام مرشد ومقتداء سے بڑھ کر رہا۔ اور چاہت دل کی اتھا گہرائیوں تک رہی۔ اور انہوں نے بھی شفقت ومودت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حقیقت پروری وخودنوازی کی انتہا کردی۔ جب بھی ملن ہوا دونوں بازؤں کو وا کر کے ملے اور سینے سے لگا کر ملے اور سینے چمٹا کر کے ملے اور ایسے ملے کہ دل کے سارے دل درد دور ہو گئے۔ سارے غم غلط ہو گئے اور ساری کلفتیں جاتی رہیں یقیناً وہ درویش خود آگاہ وخدا مست میرے لئے ایک ایسا چھتنار وگھنا شجر سایہ دار تھے، جسکی الفتیں، محبتیں، مسکراہٹیں اور مہربانیاں اتنی گہری اور پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کی گھنی چھاؤں پر ہر آن ٹھنڈک چھڑکتی رہتی تھی۔

میں جب بھی ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا، اور وقت بے وقت جب بھی ان کے دروازہ پر پہنچا ہمیشہ خندہ رو و درخشندہ جبیں سے گلے لگایا۔ اور رخشندہ انداز وتابندہ اطوار کا معاملہ فرمایا نہ پیشانی پر کوئی شکن ہوئی اور نہ ہی چہرے پر ناگواری کا کوئی نشان دیکھائی دیا۔ لہجے وہی تازگی، تکلم میں وہی روانی، لفظوں میں وہی بہاؤ اور رویے میں وہی خوش خلقی ہویدا تھی جو ان کے ملنے والے سدا دیکھتے آئے تھے

میں نے جب بھی آنکھیں موند کے بیتے دنوں میں جھانکا
اک چہرے کو ہنستے دیکھا، ہاتھوں میں تصویر اٹھائے

شخص اور شخصیت کے مابین ویسا ہی فرق ہے جیسا انسان اور انسانیت کے درمیان ہے اور آں ممدوح کا خیال آتے ہی ایک ایسی دلنواز شخصیت کا تصور ابھر آتا ہے جو مرنجان مرنج ومجموعہ اخلاق کا

ایک بے نظیر پیکر، صبر وتحمل، حلم وعفو کا روشن چاند اور عجز وانکساری کا گوہر بے مثل ہے۔ اور ایسے کثیر الجہا ت تھے جنکے لب گفتار کی شیرنی شمع دلربا کی صورت میں نہ صرف خیابان ہستی کے نفوس نفیسہ کو بلکہ اتقاس کشیفہ کو بھی ورطۂ حیرت سے انگشت بدنداں کر دیتی تھی۔ وہ اگر ایک طرف پیشہ ورانہ کمال خطاطی کے تخت ثریا پر جلوہ آرا تھے تو دوسری طرف جمال ولایت کی مسند رفیع پر رونق افروز۔ ایک جانب اگر حلقۂ ادب وعلم میں شہرت ونا موری حاصل کی تو دوسری جانب تہذیب وثقافت کے مرد میدان رہے۔ یہاں تک کہ ہر شعبہ زندگی کے بڑوں نے انہیں بڑا مانا اور کامیابیوں وکامرانیوں کے ہار پہنائے ہیں۔ ان گنت مشہور لوگوں سے زیادہ مشہور رہے۔ اور باوجو یکہ نا طالب شہرت تھے اور نا خواستگار ناموری۔ شاہراہ شہرت کے راہ رو وراہِ مراد راکب دلربا رہے۔

اور اس پر آشوب دور ونفسانی کے عالم میں خیال خاطر احباب کے لئے عمر بھر اسطرح متفکر وسرگرداں رہے کہ بغیر کسی ستائش وصلہ کی خواہش وتمنا کے، ہمیشہ اپنے اِن سفید پوش آشناؤں وشناساؤ ں کے کام آنیکی سعی فرماتے رہے۔ جو اپنی عزت نفس کے باعث آڑے وقت میں کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے سے قاصر تھے۔ یہی نہیں ان کی اس انداز مدد کرتے تھے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہیں ہو تی تھی کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا گیا ہے۔ کیسے اور کیونکر دیا گیا ہے۔ ہر حال میں دوسروں کی عزت نفس کو بھی اپنی عزت نفس کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے۔

اور ہر ایسے ماحول ومعاشرے میں جہاں دن بدن خود غرضی، خود پرستی، خود فریبی اور خبط نفس کا روگ ناسور کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ان کا وجود باوجود بسا غنمیت ہی نہیں یقیناً نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اور انسان کی بنیادی شرافت، دیانت، قناعت اور پیہم ومسلسل بے لوث خدمت کی اعلیٰ اقدار پر ہمارے یقین کو مستحکم ومضبوط کرتا تھا۔

اور اس تیور بدلتے ہوئے تیز رفتار وسفاک زمانے میں جہاں تہذیبی قدریں پامال اور اخلاقی اقدار تیزی سے تاراج ہو رہے ہیں۔ ان جیسی بردبار وحلیم الطبع شخصیت جنہیں ذات باری تعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر کامرانیوں سے ہمکنار کیا اور بے شمار نعمتوں سے بہرہ ور فرما کر باعث رشک بنا دیا تھا۔ منکسر المزاج، شائستہ عادات، شائستہ اطوار اور مہذب ہستی کی حیثیت سے جانے گئے۔ ملنسار ووفا شعار، ہنس مکھ اور احساس ذمہ داری سے بھرپور کامیاب زندگی نے انہیں ہمیشہ شکر پر مائل رکھا تھا اور ان

کے پاس آنے والا خواہ اپنا تھا یا پرایا۔شناسا تھا یا نا آشنا، ہر ایک کو اپنائیت سے گلے لگایا۔احترام واکرام کی نظر سے دیکھا اور خلوصِ دل کیساتھ خوش آمدید کہا۔

راقم آثم کو جیسا کی ازیں بیشتر رقم کیا گیا ہے تقریباً چہار دہائیوں کے عرصہ پر مشتمل ذاتی طور پر ان سے عقیدت مندی و نیاز مندی کی سعادت وشرف حاصل رہا ہے۔اور میرا ذاتی تجربہ ومشاہدہ ہے کہ وہ لاتعداد ضرورت مند صاحبِ منزلت لوگوں کی نہایت خاموشی کیساتھ اس انداز سے اعانت و معاونت فرماتے رہے کہ کبھی انکی انا وخودداری کو مجروح نہیں کیا۔کبھی عزتِ نفس پر آنچ نہیں آنے دی۔

آپ محض القاب ولقب کی حد تک نفیس نہیں تھے۔اور نہ ہی خطاطی وکتابت کے الفاظ و حروف کی ترکیب وسنت کی دنیا میں خوش نویسی ونفاست کاری کے باعث ''نفیس'' کہلاتے تھے۔ بلکہ ہر اعتبار و ہر پہلو اور ہر عمل و ہر معاملہ میں نفسیانہ ترکتازیوں کا مظاہرہ کرتے تھے۔اور ہر ادا و حرکت میں نفیس شعاریوں کے دھنکی رنگ بکھیرتے تھے۔ان کی باتیں نفیس انداز کی ہوتیں۔اور باتیں کہنے کے انداز میں نفاست ٹپکتی تھی۔لب ولہجہ میں نفاست،تبسم ومسکراہٹ میں نفاست،غذاء وخوراک میں نفاست،لباس وپوشاک میں نفاست،بود وباش میں نفاست۔غرض ہر سو و ہر سمت نفاست اور ہر پہلو و ہر جہت سے نفاست گویا وہ نفوس نفائس کے قالب میں ڈھل کر انفاس نفیس کے پیکر میں اتارے گئے تھے۔

داستان عید گل را ز تطہیری می شنو
عندلیب آ شفتہ تر می گوید افسانہ را

ان کی ذات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے،صفات پر ڈھیروں الفاظ نچھاور کیے جاسکتے ہیں اور تعریف میں درجنوں القاب وضع کر کے زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاسکتے ہیں۔لیکن سو باتوں کی ایک بات کہ خود انکا نام ہی اپنے اندر الفاظ والقاب کا ایک جہاں بسائے ہوئے اور تعریف وتوصیف کی دنیا آباد کیئے ہوئے ہے۔

رکھنے والوں نے ان کا نام سید انور حسین رکھا۔اور انہیں اپنے نام کی معنویت سے خوب خوب حصہ وافر عطا ہوا۔خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ کے بمصداق۔صرف پیدائشی سید وسردار ہی نہیں جدی پشتی سیادت وقیادت کے حامل تھے۔اور صرف سو برس سے پیشہ آباء سپاہ گری نہیں

چہاردہ صد برس سے سید القوم کی مسند نشینی ترکہ میں پائی تھی ۔ انور۔ سراپا نور و روشنی لمعۂ منور۔ مشعل ضیا بار۔ قندیل تابناک اور اجالا ہی اجالا ۔ اور اس تثلیثِ اجزاءِ رسمی کا ثلث ثالث ''حسین'' تھے جب آپ چاہیں تو بضم الحاء و فتح السین سے پڑھیں یا بفتح الحاء و کسر السین سے تلفظ کریں۔ یہ رہیں گے حسین ہی ۔ اور نام کی مناسبت سے جیسے یہ بچپن میں حسین تھے ۔ لڑکپن بھی حسین رہے ۔ جوانی بھی بے داغ و حسین گذاری اور شباب و کہولت بھی حسین مسکراہٹوں سے لبریز رہی ، لاریب ، سید انور حسین ۔

جو آئے چل کر ایک ہمہ جہت ہستی کے روپ میں سامنے آئے ۔ اور سید نفیس الحسینی کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئے ۔ انکی زندگی کی ساری جہتیں بے نظیر سارے پہلو لاجواب اور سارے رخ بے مثال تھے ۔ اسی طرح انکی ہمہ رنگ شخصیت کے سارے رنگ دل آویز۔ سارے انداز من بھاون اور سارے اطوار دل لبھانے والے تھے ۔ اور ان کی سیرت کے سارے عنوان جلی سارے موضوع مصری اور ساری حیاتی ایک کھلی کتاب تھی ۔ جس میں قوس وقزح کے دھنکی رنگ میں رنگے ہوئے خوبصورت الفاظ و حروف نے جمالیات کی ایک دنیا بسا کر انہیں اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔

وہ رنگ و نسل ، کنبہ و قبیلہ ، حسب و نسب اور خطہ و علاقہ کی تمیز سے ماوراء ''انسان'' کو صرف اس کے اخلاق و کردار کے پیمانوں سے ناپتے اور زندہ لوگوں کے درمیان اپنے اعصاب کو انتہائی توانا و مضبوط رکھتے تھے ۔ اعلیٰ پائے کا سلیقہ ، نشست و برخاست ، اعلیٰ پائے کا ذوق خورد و نوش اور اعلیٰ پائے کا طریقۂ مہمان داری و مہمان نوازی کے حامل تھے ۔ اور اوائل عمری سے ہی سراپائے صدق وسچائی اور صدق وسچائی کے پرستار و داعی تھے ۔ حرص و آز سے لابلد۔ حوس و لالچ سے ناآشنا اور کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی اثبات و استقامت کے پہاڑ دکھائی دیتے تھے ۔ سب کے مفاد میں سوچتے ، سب کو اپنا سمجھتے اور سب کے ساتھ یکساں اپنائیت کا معاملہ فرماتے تھے ۔

اسلام کے والہ و شیداء ، بانیء اسلام علیہ اسلام کے شیفتہ و فریفتہ ۔ اور اسلام کے اولین متوالوں کے بارے میں پہاڑوں کی اٹل اور ان کے دامن میں بہنے والے چشموں کی طرح صاف شفاف نظریہ کے حامل تھے ۔

زندگی کا ایک ایک لمحہ نظم و ضبط اور فرض شناسی میں ڈھلا ہوا ۔ اور بندگیٔ باری تعالیٰ میں ہر لحظہ گرم دم جستجو رہتے تھے ۔

بظاہر وہ ایک شخصیت تھے: شخص واحد دکھائی دیتے۔ ایک ذات کے روپ میں نظر آتے اور صرف ایک فرد فرید محسوس ہوتے تھے۔ مگر نہیں وہ فرد کہاں الٰہی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اور ہمہ گیر ہستی کی شکل میں ایک مجموعۂ مہ و ماہ اور جلو میں کہکشاں کی دنیا بسائے ہوئے تھے۔ انسان جب انکی گوناگوں مصروفیات کو دیکھتا اور طرح طرح کے مشاغل پر نگاہ ڈالتا تو حیران و ششدر رہ جاتا کہ جیسے ہی کوئی شغل و مشغلہ اختتام پذیر ہوتا تو معاً دیگر بیسیوں دوسری تشنہ توجہ سرگرمیاں انہیں دعوت عمل دیتی نظر آتی تھیں اور یوں اس ایک فرد کے پھیلاؤ کا سمیٹنا دشوار سے دشوار تر لگتا تھا۔ مگر صد حیف کے وہ اپنی روایتی خندہ جبینی و سدا بہار تبسم انگیزی سے سب کچھ کر گذرتے تھے۔ اور زبان پر حرف شکایت تک نہیں کرتے تھے۔

بلاشبہ وہ لفظوں کے آدمی تھے اور ساری زندگی الفاظ و حروف کی ترتیب و ترکیب، بنت و آرائش اور سجانے سنورنے میں بتادی۔ مگر حیرت ہے کہ فلسفیوں کے اسرار و رموز سے آگاہی پانے اور نکتہ وروں کی آگہی و نکتہ آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود لفاظی سے ہمیشہ گریز یا نفور ہی رہے۔ بعض کج فکر و کج فہم اور تنگ دل و تنگ نظر علماء کی یہ منہ شگافی کہ شاہ صاحب کسی جامعہ کے فارغ التحصیل نہیں تھے اور نہ ہی کسی دارالعلوم میں کسی عالمِ دین کے سامنے کبھی زانوئے تلمذ طے کئے تھے۔ ایسے میں انہیں زیبا نہیں تھا کہ علماء کو بیعت کرتے۔ ان کے پیر و مرشد بنتے اور نہ ہی کسی عالم کے لیے رواء و درست تھا کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے۔ مقتداء و ہادی تسلیم کرتے۔

تکلف برطرف۔ اگر علم صرف کسی جامعہ دارلعلوم میں رہ کر ہی سیکھا جاسکتا ہے اور عالم بننے کیلئے کسی مدرسہ و مکتب کا فارغ التحصیل ہونا ضروری و لازمی ہے تو تاریخ میں کتنے ایسے رجال باصفا کے نام ہمیں ملتے ہیں جو اُمی محض تھے مگر تلمیذ الرحمٰن کے وصف سے متصف اور علمِ لدنی وھبی سے بہرہ ور ہو کر اپنے عہد و زمانہ کے سینکڑوں علماء و فضلاء کے رہبر بنے، مرجع الاخلاق ٹھہرے۔ اور علم و فضیلت کی دنیا نے انکی عظمت کے گن گائے۔ ان کی عزیمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

دور کیوں جائیں ماضی قریب میں اسی برِ صغیر پاک و ہند کی خاک فاراشگاف سے کتنے ایسے جہلاء نے جنم لیا ہے۔ جن کے حضور بڑے بڑے علماء چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں اور انکی جوتیوں کی جھول کو خاکِ شفا سمجھا جاتا ہے۔ بطورِ نمونہ، سید الطائفہ سید احمد شہید بریلویؒ۔ اور سرخیل و گل سرسبد علماءِ

دیوبند، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ آخر کہاں کے سند یافتہ اور کس دار العلوم کے فارغ التحصیل تھے۔حافظ الحدیث شیخ درخواستیؒ کو کس جامعہ کی طرف سے سندِ فراغت دی گئی۔اور کس دانش کدہ کی طرف سے مجازِ علم ٹھرائے گئے۔یقیناً یہ کسی مدرسہ کے کبھی مدرس نہیں رہے۔مگر حیرت ہے کہ جس قدر برکات و فیوض کا فیضان ذی شان ان نفوسِ قدسیہ کے حوالے سے صرف برصغیر ہی نہیں اطراف واکناف عالم تک پہنچا ہے۔شاید ہی یہ رتبہ بلند کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔

ان کے فیض یافتگان اور خلفاء ومجازین کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ اسے دیکھ کر خامہ انگشت بدنداں اور ناطقہ سر بگریباں ہو جاتا ہے۔ہمارے ممدوح موصوف حضرت نفیس الحسینی کے پیر ومرشد، حضرت مولانا عبد القادر رائپوری علیہ الرحمۃ نے جن خوشا طالع اشخاص وافراد کو احسان وسلوک کے مدارج اور تصوف وعرفان کی منازل طے کرا کے اجازت وخلافت مرحمت فرمائی تھے انکی فہرست حضرت الشیخ للہی نور اللہ مرقدہ نے ''حیاتِ طیبہ'' میں درج کی ہے۔وہ ساٹھ اشخاص پر مشتمل ہے۔اور ان میں ایک درجن کے سواء باقی سب اپنے زمانۂ عہد کے متبحر و یگانہ روزگار عالم تھے۔جبکہ حضرت نفیس الحسینیؒ کے فیض یافتگان کی تعداد ایک صد دس ۱۱۰ ہے۔جن میں سے انسٹھ علماء چودہ حفاظ وقراء۔ستائیس محسن و مخلص اور آٹھ دیگر سلاسل طیبہ کی وہ جلیل القدر شخصیات ہیں جنکے تفضّل علمی مقدمات دینی کے پیشِ نظر انہیں اعزازی طور پر اجازت دی گئی ہے۔

اور سچ یہ ہے کہ جس قدر مقتدر علماء وصلحاء کی مراجعت ان کی طرف ہوتی ہے اور وہ روحانی طور پر ان سے مستفید و مستفیض ہوئے ہیں ان کی معاصرین میں شاید ہی کسی اور سے فیضیاب ہوئے ہوں۔

''یہ رتبہ بلند ملا جسے مل گیا''

ہائے منیر نیازی مرحوم یاد بھی آئے تو کس موقع ومحل میں

خیال جس کا تھا خیال میں ملا مجھے
سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے
گیا تو اس طرح گیا کہ مدتوں نہیں ملا
ملا جو پھر تو یوں کہ وہ ملال نہیں مجھے

میں سید صاحب کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں۔کلک وقرطاس میرے سامنے ہیں حافظے کے خزانے میں چہل سالہ یادوں کے سارے موتی جمع ہیں۔الفاظ وحروف کی آورداور آمد آمد ہے۔اور مردہ قلوب میں حیات شگفتہ بخشنے والے ان گنت مشاہدات ووقعات ذہن کی سکرین پر جگمگا رہے ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کیسے لکھوں کہاں سے شروع کروں اور کیوں کر ورطۂ تحریر میں لاؤں۔ایسی شخصیت کی داستان حیات کا احاطہ کرنا رہ گذر زمانہ پر جنکے قدموں کے ڈھیروں نقوش ثبت ہوں اور لوگوں کے دلوں میں یادوں کے لاتعداد چراغ جل رہے ہوں۔

ایک ایسے شخص کے لئے جسے اپنی کم مائیگی وہیچدانی کا احساس شدت سے دامن گیر ہے۔ صرف مشکل ہی نہیں ناممکن بھی لگ رہا ہے۔سجیلی نثر نگاری سے صفحہ قرطاس پر الفاظ کے چراغ وہی چلاسکتا ہے اور جملوں کی کہکشاں اتار سکتا ہے جسے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن آتا ہو۔مضمون کو کالی برکھا کا تسلسل دے سکتا ہو۔اور چودھویں کی شب میں قدرت خیالی کی جگمگاتی چاندنی کا تاج محل استوار کرسکتا ہو۔اوراس کا قلم مست خرام ندی کی طرح چل سکتا ہو۔میرے لئے یہ سب کچھ اسلئے ناممکن ہے کہ یہاں صرف ایک ہی نہیں کئی دریاؤں کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

اورمرور زمانہ کوزہ گری متروک اور کوزہ گھری معیوب گردانی جانے لگتی ہے۔اگر کہیں خال خال اسکی مثیل نظر آتی بھی ہے تو وہ بے پیندا کا لوٹا کہلاتا ہے۔جسے آجکل بے خمیری کی علامت اور بے غیرتی کا نشان یقین کیا جاتا ہے۔اور گاہِ بہ گاہِ اسکی صدائے بازگشت اسمبلیوں میں سنی اور ذرائے ابلاغ میں دیکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

ایسے میں اس ہستی کے متعلق کیا کیا اور کہا اور کیا لکھا جاسکتا ہے۔جن کا وجود باجود شیریں مقال مقرر وشعلہ بیاں خطیب نہ ہونے کے باوجود پیکر دعوت وتبلیغ بن کر سراپائے محمود ومسعود بن گیا تھا اور قدرت نے آپ کو راسخ الفکر وخاموش مبلغ کے قالب میں ڈھال کر کئی اداروں واکیڈمیوں کے کام سے زیادہ بھاری کام۔

خاموش خدمت دین کی صورت میں لیا تھا۔

قلم بشکن ،سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حمید ایں قصہء عشق است دردفتر نمی گنجد

کچھ منکرین الہاماتِ مرزا کے بارے میں

تاریخ ایک نہایت ہی سنجیدہ موضوع ہے، اس میں ذرا سی لغزش اصلیت کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہم تاریخ میں بددیانتی کے قائل نہیں ہیں، ہمارا طریقہ یہ ہے کہ جس نے تاریخ میں جو بھی کردار ادا کیا ہے اس کو اُسی طرح سے بیان کیا جائے۔ چاہے غلط کردار ہو یا صحیح، اس میں اپنے اور پرائے کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے غیر مقلدین کے مکتبہ فکر کے چند اکابر کے مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات کی تصدیق کے بارے میں احوال واقوال نقل کئے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ غیر مقلد تھا، اس لئے فطری طور پر اُسی کے مسلک کے لوگوں کا اُس پر غیر متزلزل یقین سمجھ میں آنے والی بات ہے، یہی وجہ ہے کہ حنفی المسلک علماء لدھیانہ کے فتوائے کی مخالفت بھی اسی مکتب فکر کی طرف سے زیادہ ہوئی۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سارے ہی غیر مقلدین نے مرزا قادیانی کے الہامات کو سچا مان لیا تھا۔ کچھ غیر مقلد علماء ایسے بھی تھے جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ہم مسلک ہونے کے باوجود اُس کے الہامات کے منکر ہو گئے۔

اسی سلسلہ میں ایک جگہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رقم فرما ہیں:

> اس کتاب (براہین احمدیہ) کے خاص معرفین اور پرجوش تائید کرنے والوں میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' میں اس پر ایک طویل تبصرہ یا تقریظ لکھی جو رسالہ کے چھ نمبروں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کتاب کو بڑے شاندار الفاظ میں سراہا گیا ہے اور اس کو عصر حاضر کا ایک علمی کارنامہ اور تصنیفی شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی 'مولانا 'مرزا صاحب کے دعاوی اور الہامات سے کھٹک گئے اور بالآخر وہ ان کے بڑے حریف اور مدِّ

مقابل بن گئے ۔

اس کے برخلاف بعض علماء کواسی کتاب سے کھٹک پیدا ہوئی اوران کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ شخص نبوت کا مدعی ہے۔یا عنقریب دعویٰ کرنے والا ہے۔ان صاحبِ فراست لوگوں میں مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانویؒ مرحوم کے دونوں صاحبزادے مولانا محمد صاحبؒ اورمولانا عبدالعزیز صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امرتسر کے اہل حدیث علماء اورغزنوی حضرات میں سے بھی چند صاحبوں نے ان الہامات کی مخالفت کی اوراس کومستبعد قراردیا۔(قادیانیت ص ۵۸،۵۹)

یہاں پرغور کریں کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے امرتسر کے اہل حدیث علما کی مخالفت کا بھی ذکر کیا ہے۔انہی کومولانا محمد حسین بٹالوی نے اپنی تحریروں میں لتاڑا ہے۔جس کی کچھ تفصیل ہم گذشتہ شماروں میں بیان کر چکے ہیں۔مولانا محمد حسین بٹالوی کوعلماء لدھیانہ سے اتنا شکوہ نہیں تھا جتنا کہ اپنے ہم مسلک اہل علم سے تھا،اس کے باوجود کہ ان کے ہم مسلک اہل علم نے صرف مرزاغلام احمد قادیانی کے الہامات کاانکار کیا تھا کفر کا فتویٰ نہیں دیا تھا،مگر پھر بھی مولانا محمد حسین بٹالوی کے نزدیک ان کے ہم مسلک علما کا انکار علماء لدھیانہ کے کفر کے فتوے سے اشد تھا۔اس لئے مولانا بٹالوی نے اپنے ہم مسلک علما سے بحث کی ہے۔مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں:

فریق اوّل (امرتسری منکروں) کی وجہ انکار کا جواب

اس فریق (امرتسری منکرین) کا انکار گوصورۃً انکارفریق دوم (علماءلدھیانہ) سے اخف ہے(کیونکہ فریق دوم مکفرّ ہے یہ مکفرّنہیں)مگر درحقیقت یہ انکار اشد ہے ۔اس لیے کہ فریق دوم کا انکار گوحد تکفیر تک پہنچا ہوا ہے مگر وہ صرف اور خاص کرالہامات مؤلف ''براہین احمدیہ'' کے متعلق ہے ان کے سوا اولیاء اللہ کے الہامات سے اس کوتعلق نہیں اوران کومطلق الہام اولیاء اللہ سے انکارنہیں اور یہ حضرات (فریق اوّل) معتزلہ اور نیچریہ کی طرح مطلق اولیاءاللہ کے الہام غیبی (ہمرنگ وحی) سے انکاری ہیں۔

اور مؤلف براہین کے سواء بھی کسی ولی (سری سقطی ۔جنید بغدادی ۔شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ)کے الہام غیبی کونہیں مانتے ۔اس لیے انکا انکار بلاتکفیر فریق دوم

کے انکار یا تکفیر سے اشد اور اغلظ ہے۔اور اس کا جواب و تعاقب بہ نسبت جواب انکار فریقِ دوم اہم واقدم ہے،اور اس میں نہ صرف مؤلف براہین احمدیہ اور اولیاء اللہ کے الہامات کی نصرت وحمایت متصور ومقصود ہے بلکہ الہامِ انبیاء کی تائید بھی اس میں متحقق ہے۔اور یہی تائید (الہامِ انبیاء) ہمارا اصلی مقصد ہے۔

اس لئے کہ غیر نبی کے الہامِ غیبی سے مطلق انکار نبی کے الہام سے انکار کا مقدمہ ہے،اور اس کی طرف کھینچ کر لے جاسکتا ہے کیونکہ دونوں الہاموں کا حال و اصول ایک ہے، بلکہ سچ پوچھو تو وہ دونوں ایک ہی چشمہ یا منبع کی دو نہریں ہیں۔لہذا ایک سے انکار ہو تو دوسرے کے تسلیم کرنے کی عقلی وجہ کوئی نہیں۔اور ایک کے وجود سے انکار کرنے سے دوسرے سے انکار کرنے کا بھی خوف ہے۔اسی وجہ سے محققینِ اہلِ اعرفان نے کہا ہے ''جس کو اولیاء کے اس فیضِ باطنی اور علمِ لدنی سے انکار ہو،اس کو سوءِ خاتمہ کا خواف ہے،شاید اس کے دل میں ایک نہ ایک دن انبیاء کے علم لدنی والہامِ غیبی سے انکار بھی جگہ پکڑلے''

(اشاعۃ السنۃ صفحہ ۱۹۴ شمارہ ۷ جلد ۷)

اس کے بعد مولانا بٹالوی نے تفصیل کے ساتھ اپنے ہم مسلک منکرینِ مرزا کی خوب خبر لی ہے،اسکی تفصیل راقم کی کتاب ''سب سے پہلا فتوائے تکفیر'' کے دوسری ایڈیشن میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے،جو کہ ابھی زیر ترتیب ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کا بیان

مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شروع شروع میں ''براہین احمدیہ'' کو الہامی کتاب سمجھ کر علماء لدھیانہ کے فتوائے تکفیر ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء کے ایک سال بعد ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کی زیارت کے لئے بٹالہ سے پاپیادہ قادیان گئے تھے،مگر جب ان کا مرزا قادیانی سے اختلاف ہوا تو انہوں نے اپنی کتاب ''تاریخ مرزا'' میں ان غیر مقلد اہل علم کے انکار کو یوں بیان کیا۔

جس زور شور سے اس کتاب کا اشتہار تھا،آخر کار نکلی تو صورت اس کی یہ تھی کہ ایک جلد موٹے حرفوں میں صرف اس کے اشتہار کی تھی باقی جلدوں میں مضامین شروع ہوئے

مگر مضامین کی بنا زیادہ تر اپنے الہامات اور مکاشفات پر تھی لیکن وہ الہامات ایسے کچھ صاف اور صریح اسلام کے مخالف نہ تھے بلکہ بعض معاون بعض گول۔اس لیے حسن ظن علماء اس پر مرزا صاحب سے مانوس ہی رہے۔اس زمانہ میں سب سے بڑے مانوس مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی ایڈیٹر اشاعۃ السنہ تھے۔جنہوں نے اس کتاب پر بڑا بسیط ریویو لکھا۔اور مخالفین کو جوابات دیئے۔

باوجود اس کے دور اندیش علماء اسلام مرزا صاحب سے خوفزدہ تھے۔مولانا حافظ عبدالمنان مرحوم محدث وزیر آبادی سے میں نے خود سنا کہ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کسی دن یہ شخص (مرزا) نبوت کا دعویٰ کرے گا ،ایسا ہی حضرت مولانا ابوعبداللہ غلام العلی صاحب مرحوم امرتسری سے سننے والوں کا بیان ہے۔

کہ مرحوم بھی مرزا صاحب سے خوف زدہ تھے کہ کسی دن نبوت کا دعویٰ کریں گے۔مرزا صاحب نے براہین احمدیہ میں مولوی صاحب مرحوم کا نام لے کر رد بھی کیا ہے۔ایسا ہی مولوی غلام دستگیر مرحوم قصوری اور مولوی محمد وغیرہ خاندان علماء لودہانہ بھی مرزا صاحب سے بدظن تھے۔ہم حیران ہیں ان علماء کی فراست کس درجہ کی تھی کہ آخرکار وہی ہوا جو ان حضرات نے گمان کیا تھا۔ (تاریخ مرزا ص: ۱۳،شائع کردہ مکتبہ سلفیہ لاہور)

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے یہاں پر واضح کیا ہے کہ ان کے یہ دونوں اہل حدیث بزرگ مولانا حافظ عبدالمنان مرحوم محدث وزیر آبادی اور حضرت مولانا ابوعبداللہ غلام العلی صاحب مرحوم امرتسری مرزا صاحب سے اس لئے خوف زدہ تھے کہ ان کا ہم مسلک (مرزا غلام احمد قادیانی) کسی دن نبوت کا دعویٰ کردے گا۔

اس کے باوجود ان اہل حدیث بزرگوں نے کفر کا فتویٰ نہیں دیا تھا یہ لوگ ابھی خوف ہی میں مبتلا تھے جبکہ علماء لدھیانہ نے خداداد بصیرت سے سمجھ لیا تھا کہ مرزا قادیانی نے در پردہ نبوت کا دعویٰ کردیا ہے اس لئے انہوں نے بلا خوف وخطر اس پر کفر کا فتویٰ دے کر پوری امت کے ایمان کی حفاظت کی بنیاد رکھ دی تھی۔

علماءِ لدھیانہ کے بعد علماءِ عرب وعجم کا سب سے پہلا متفقہ فتویٰ

ماہنامہ ''ملیہ'' کے گزشتہ شماروں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ''پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ علماء لدھیانہ ہی نے دیا ہے''۔ یہ صرف تین علماء ہی تھے۔مولانا محمد لدھیانویؒ، مولانا عبدالعزیز لدھیانویؒ، مولانا عبداللہ لدھیانویؒ۔ یہ تینوں بھائی تھے، اور اس وقت پورے ہندوستان کے علماء نے اس فتوے کی مخالفت کی تھی۔ انہی ایاّم میں علماء لدھیانہ کے اس فتوائے تکفیر مرزا قادیانی کا شہرہ حرمین شریفین میں بھی پہنچا۔اس کے متعلق مرزا قادیانی پر اوّل مکفّر مولانا محمد لدھیانوی اپنی تحریر میں فرماتے ہیں کہ:

چونکہ یہ شخص (مرزا قادیانی) غیر مقلّدین کے نزدیک قطب اور غوث وقت تھا، محمد حسین لاہوری (بٹالوی) نے جو غیر مقلدّین ہند کا مقتدا مشہور ہے، امداد قادیانی پر کمر باندھی اور اپنے رسالہ ماہواری میں ہماری مذمت اور قادیانی کی تائید کرتا رہا۔یعنی کلمات کفریہ کی اشاعت کو معاذ اللہ اشاعۃ السنۃ قرار دیتا رہا۔مصرع (برعکس نہند نام زندگی کا فور) لیکن اس ماہواری رسالہ کے ذریعے سے بموجب شعر

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد
خمیر مایہ دوکان شیشہ گر سنگ است

اکثر اہل علم کو کلمات کفریہ قادیانی کے معلوم ہوگئے اور ہمارے فتویٰ کی تصدیق کی ندا ہر طرف سے آنے لگی۔ یہاں تک مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری نے ایک استفتاء قادیانی کے باب میں علماء حرمین کی خدمت میں روانہ کیا مولانا مولوی رحمۃ اللہ مرحوم (مراد اس سے مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی ہیں) نے بعد کمال تتبع براہین احمدیہ و نہایت تفتیش رسالہ جات لاہوری (بٹالوی) کے یہ جواب لکھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔باقی علماء حرمین نے اسی مضمون کے مطابق اپنی اپنی رائیں ظاہر کیں۔(فتاویٰ قادریہ صفحہ ۱۸ تا ۱۹)

علماء لدھیانہ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریرات پر سب سے پہلی اور کڑی گرفت مولانا

غلام دستگیر قصوری نے کی (جیسا کہ مولانا محمد لدھیانویؒ کی اس تحریر سے واضح ہے)۔مولانا غلام دستگیر قصوری اپنے زمانہ کے بڑے متبحر مناظر تھے،انہیں اپنے فن میں کمال کی دسترس حاصل تھی۔وہ بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے والی شخصیت تھے۔بریلوی مکتب فکر کے حضرات ان کو اپنے مکتب فکر میں شمار کرتے ہیں،مگر وہ اس وقت منظر عام پر آئے جب کہ بریلوی مکتب فکر نام کی کوئی تحریک نہ تھی،وہ مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ہم عصر تھے،مولانا غلام دستگیر قصوری اپنے حلقہ میں ایک فیصلہ کن کی حیثیت رکھتے تھے۔یہ بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ علماء لدھیانہ تھے،اکابر علماء لدھیانہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی علم دین سے فراغت حاصل کر چکے تھے،اور پھر انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فتویٰ فرضیت جہاد بھی دیا اور جنگ میں بھرپور شرکت بھی کی۔

جبکہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی۔اس وقت دیوبندی مکتب فکر کے نام سے بھی کوئی تحریک نہ تھی،صرف ایک مدرسہ تھا جو کہ بام عروج کی طرف گامزن تھا۔بعد میں آنے والے کچھ حضرات نے ان اکابر علماء لدھیانہ کو ہم مسلک ہونے کی بنیاد پر دیوبند کے منتسبین میں شامل کر دیا جو کہ صحیح نہیں۔اسی طرح مولانا غلام دستگیر قصوری کی شخصیت تھی،جو کہ اُس زمانے میں بدعت کو حسنہ کے عنوان سے فروغ دینے میں پیش پیش تھے،جو کہ بریلوی مکتب فکر کی اساس ہے۔اسی لئے بریلوی مکتب فکر کے حضرات ان کو بھی اپنے ہی مکتب فکر میں شمار کرتے ہیں۔

بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ لوگ بعض اکابرین امت کو اپنی ذہنی ہم آہنگی کی بنیاد پر اپنے ہی مکتب فکر میں شمار کرنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ ان کی آل اولاد اس انتساب کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔مجھے ایک واقعہ یاد ہے،میں ایک دفعہ جامعہ مدنیہ لاہور میں حضرت سید نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا،کہ ایک پیر صاحب اپنے دو تین مریدوں کے ساتھ تشریف لائے، معلوم ہوا کہ یہ صاحب پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ گولڑہ راولپنڈی والوں کے گدی نشین جناب نصیرالدّین نصیر صاحب ہیں۔حضرت شاہ صاحب نے سادہ سی پیالیوں میں چائے پیش کی،اس پر پیر نصیرالدین صاحب نے دو تین بار فرمایا ''حضرت ان سادہ پیالیوں میں جو نورانیت محسوس ہوئی وہ کسی اعلیٰ قسم کی پیالیوں میں نہیں دیکھی''۔باتوں باتوں میں حضرت شاہ صاحبؒ نے پیر صاحب سے پوچھا کہ آپ کے جدامجد حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے متعلق مشہور کیا جا رہا ہے کہ وہ بریلوی مکتب فکر سے

تعلق رکھتے تھے جبکہ ان کا تعلق حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھا۔ تو اس پر پیر نصیر الدّین صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کانوں تک لے گئے اور کہا

''ہمارے اعلیٰ حضرت تو بریلوی نہیں تھے''

یہ بات انہوں نے دو تین بار کہی۔ تو اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کو آپ لکھیں، تو اس پر پیر نصیر الدّین صاحب نے کہا کہ ضرور ضرور یہ کام جلدی ہی ہوگا۔ معلوم نہیں بعد میں انہوں نے یہ کام کیا یا نہیں۔ میرا لکھنے کا مطلب یہ کے اسی طرح کا معاملہ مولانا غلام دستگیر قصوری کا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا مولانا غلام دستگیر سے تعارف مولانا محمد حسین بٹالوی کے رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' کے ان شماروں سے ہوا جس میں مولانا بٹالوی نے علماء لدھیانہ کے ''فتوائے تکفیر'' ۱۳۰۱ھ کے رَدّ میں مضامین لکھے تھے۔

مولانا غلام دستگیر قصوری سے مرزا قادیانی کا تعارف ۱۳۰۲ھ کا واقعہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے مولانا غلام دستگیر قصوری کو مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی کتاب ''براہین احمدیہ'' کا ان نکات کو ملحوظ رکھ کر بغور مطالعہ کیا جن کی بنا پر علماء لدھیانہ نے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔

نیز اس کی کتاب پر غیر مقلّدین کے مشہور سرپرست مولانا محمد حسین بٹالوی کے اس تبصرہ کا بھی موازنہ کیا جو کہ بٹالوی صاحب نے علماء لدھیانہ کے فتوائے تکفیر کے رَدّ اور مرزا قادیانی کے حق میں لکھا تھا۔

اس ضمن میں مولانا غلام دستگیر قصوری اپنی ایک کتاب ''فتح رحمانی بہ دفع کید کادیانی'' میں لکھتے ہیں:

> عبدہ الحقیر محمد ابو عبدالرحمٰن فقیر غلام دستگیر ہاشمی حنفی قصوری کان اللہ لہٗ، برادران دین اسلام کی خدمت میں اعلام کرتا ہے کہ فقیر ابتداء ۱۳۰۲ھ ہجری مقدسہ سے مرزا غلام احمد قادیانی کو دنیا پرست اور دین فروش جانتا ہے، چنانچہ محض ابتغاء لمرضات اللہ اس کی تردید میں حتی الامکان مصروفیت کر کے حضرات علماء حرمین محترمین زادہما اللہ تعالیٰ حرمۃً وشرفاً سے اس کی کتاب ''براہین احمدیہ اور رسالہ اشاعۃ السنۃ'' ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ

ومحرم ۱۳۰۲ھ جس میں اس کی تاویلیں تھیں بھیج کر استفتاء کیا تھا، کہ ایسا شخص جو اپنے الہام کو مرادف وحی انبیاء یعنی قطعی و یقینی جانتا ہے اور انبیاء سے کھلی کھلی برابری بلکہ بعض جگہ اپنے آپ کو انبیاء سے بڑھاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اس پر حضرت مولانا مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ الرحمۃ نے (جو منجانب حضرت سلطان روم بتجویز حضرت شیخ الاسلام کے ملقب بخطاب پایہ حرمین شریفین ہیں) فقیر کے رسالہ ''رَجْمُ الشَّيَاطِيْنِ بِرَدِّ اُغْلُوْطَاتِ الْبَرَاهِيْن'' کی نقول کو مطابق اصل براہین کر کے لکھ دیا کہ مرزا قادیانی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ پھر حضرات مفتیان نے بھی اس کے بارہ میں قادیانی شیطانی اور مسیلمہ کذاب ثانی وغیرہما الفاظ کو استعمال فرما کر رسالہ موصوفہ کی کمال تصدیق فرمائی، جو ۱۳۰۵ھ میں واپس آیا، جس کو فقیر نے بعد مدت دراز اس کی توبہ کے انتظار کے ۱۳۱۲ھ کے صفر میں شائع کر کے اپنی سبکدوشی حاصل کر لی۔

(فتح رحمانی بہ دفع کید کادیانی صفحہ ۱۔۲)

مولانا غلام دستگیر قصوری نے یہ استفتاء ۱۳۰۳ھ کو مرتب کر کے حرمین شریفین بھیجا جاتھا جس کا جواب ۱۳۰۵ھ میں آیا، اور اس کی اشاعت ۱۳۱۲ھ میں ہوئی۔ مولانا قصوری صفحہ نمبر ۱ پر اس کی ابتداء ان کلمات سے کرتے ہیں:

باسمہ سبحانہ ، حامداً و مصلّیاً

رجم الشیاطین بردّ اغلوطات البراهین

یہ رسالہ ہدایت مقالہ جس کو اکابر علماء و فضلائے عجم کی پسندیدگی علاوہ حضرات مفتیان و مدرسان حرمین محترین زادہما اللہ تعالیٰ شرفاً و تعظیماً نے بھی نہایت ہی تحسین فرمائی ہے، تردید ہے مفتریا مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ ''براہین احمدیہ'' کی، جس کو فقیر غلام دستگیر ہاشمی قصوری کان اللہ لہ نے بعد مدت مدید انتظار اس کی توبہ کے شائع کیا ہے۔

بدیں غرض کہ جمیع اہل اسلام پر عموماً اور مرزا صاحب کے مریدوں پر خصوصاً انکا حال منکشف ہو جائے اور فقیر کو قیامت میں سُرخروئی حاصل آئے۔ اور ان مسلمانوں کو ہدایت ہو جو مرزا صاحب کی بعض پیشگوئیوں کے صحیح ہونے کے منتظر ہیں، اور یہ نہیں

سوچتے کہ جس کو قرآن وحدیث ردّ کرے خواہ اس کے کیسے ہی خوارق ہوں سب کچھ غیر معتبر اور مردود ہے۔ بعضے اولیاء کبار سے منقول ہے ''ما و کفار در سلوک برابریم نہ در نجات اُخروی کہ آں مربوط باتباع نبویست'' اور عیسائیوں پر بھی واضح ہو کہ مرزا صاحب تو وہ شخص ہیں جن کو عرباً وعجماً دائرہ اسلام سے خارج کررہے ہیں، ان کو اسلام کا وکیل قرار دے کر ان کی پیشگوئی کی غلطی کی انتظار کرنی اور پھر اسلام پر دھبہ لگانا سراسر انصاف وعقل سے بعید ہے۔ (۱۸/صفر ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۱/اگست ۱۸۹۴ء)

ضروری وضاحت

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مولانا قصوری کا یہ فتویٰ علماءِ لدھیانہ کے فتوے کے بعد صدور کے اعتبار سے دوسرا فتویٰ تھا، مگر اشاعت کے اعتبار سے یہ تیسرا فتویٰ ہے، جبکہ اشاعت کے اعتبار سے دوسرا فتویٰ مولانا محمد حسین بٹالوی کا ہے، اور صدور کے اعتبار سے تیسرا فتویٰ مولانا بٹالوی صاحب کا ہے۔ اس کی مزید تفصیل مولانا قصوری نے اسی فتوے کے صفحہ نمبر ۱۷ پر یوں رقم فرمائی ہے۔

گزارش مؤلف

باسمہ سبحانہ ! اس فتویٰ حرمین محترمین زاد ھم اللہ تعالیٰ حرمتہ سے جمیع اہل اسلام وخاص وعام پر بخوبی روشن ہو جائیگا کہ مرزا صاحب قادیانی کی براھین احمدیہ والی بلند پروازیوں نے ہی ان کو بشہادت مفتیان عرب وعجم دائرہ اسلام سے خارج کردیا ہے۔ وہ ہرگز الہام ربّانی کے مورد نہیں۔ یقیناً القائے شیطانی کے مصدر ہیں۔ ہر چند فقیر مؤلف کان اللہ لہ نے ابتدائے ۱۳۰۲ھ سے اولاً بذریعہ خط وکتابت ثانیاً بوسیلہ اشتہارات بہت کوشش کی کہ مرزا صاحب مناظرہ سے تحقیق حق کر کے اسلام میں رخنہ اندازی سے باز آئیں، مولوی محمد حسین بٹالوی کی تائید پر غرّہ نہ ہو جائیں، مگر بقضائے الٰہی موثر نہ ہوا۔

تب فقیر نے رسالہ مرقومہ بالا ۱۳۰۳ھ میں حرمین شریفین میں بھیج کر فتویٰ لیا۔ ۱۳۰۵ھ میں جب یہ فتویٰ آیا تب راقم نے امرتسر جا کر مرزا صاحب کے دوستوں کو دکھلایا

اوران کی معرفت مرزا قادیانی کو بلوایا کہ وہ بچشم خود اس کو ملاحظہ کر کے تائب ہو جائیں تو اس کو شائع نہ کیا جاوے۔ اس پر مرزا صاحب نہ آئے۔ فقیر نے بنظر خیر خواہی اسلام اس کے شائع کرنے میں تعویق کی کہ شاید مرزا قادیانی روبراہ ہو جائیں۔ پھر مرزا صاحب نے جب ضروری اشتہار ۲۶ مارچ ۱۸۹۱ء میں اپنے مثیل مسیح ہونے کے دعویٰ میں کئی علماء دین سے مباحثہ کے واسطے ان کے نام درج کئے اور اخیر میں فقیر کا نام بھی تحریر کیا تو اس کے جواب میں فقیر نے رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ میں دو ورقہ اشتہار شائع کر کے مختصر حال اس فتویٰ کا اور اپنی مستعدی مناظرہ کے لئے ظاہر کی اور ادّعائے مثیل مسیح کو بھی باطل کیا۔ ان کی طرف سے اس کا جواب نہ آیا۔ بعدازاں رمضان شریف ۱۳۱۰ھ میں حافظ محمد یوسف ضلعدار نے مرزا صاحب یا ان کے نائب سے مناظرہ کے واسطے تحریک کی، فقیر نے تحریر کر دی کہ میں حاضر ہوں۔ تاریخ مقررہ پر نہ مرزا صاحب نہ آئے نہ کوئی نائب ان کا مختار نامہ لے کر آیا۔

برعکس مولوی محمد احسن امروہی نے فقیر کے فرار اشتہار بنام اتمام الحجہ شائع کر دیا۔ اس کے جواب میں ایک مدرس مدرسہ قصور نے اولاً اس کی تبکیت میں اشتہار شائع کیا۔ ثانیاً فقیر نے ۱۳۱۱ھ میں دوسرا اشتہار چھپوا دیا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ مرزا صاحب کی پہلی رخنہ اندازی اسلام کے علاوہ جس پر حرمین مکرمین زادہما اللہ تعظیماً سے ان کے بارہ میں فتویٰ آچکا ہے جو انہوں نے دعویٰ مخترعہ مسیحیت میں رسالہ فتح الاسلام وتوضیح المرام وازالہ اوہام شائع کئے ہیں۔ ان میں نبوت ورسالت کا کھلا کھلا دعویٰ کر دیا ہے۔ جس سے مولوی محمد حسین بٹالوی جیسے ان کے مؤید اور ثنا خواں بھی ان کے سخت مخالف ہو کر واشگاف اور صاف صاف ان کی تکفیر کر رہے ہیں اور مرزا صاحب اور محمد احسن امروہی جیسے ان کے مریدوں کو ذرّہ بھی غیرت نہیں کہ مجمع علماء میں اپنی بریت ظاہر کر دکھائیں۔ صرف دھوکہ بازیوں سے کام چلا رہے ہیں۔

ان کی طرف سے جب اس کا جواب بھی نہ ملا تو فقیر نے اخیر صفر ۱۳۱۱ھ میں اور اشتہار جاری کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب مرزا صاحب کے راہ راست پر آنے سے مایوس ہو کر وہ فتویٰ حرمین شریفین شائع کیا جاتا ہے جس سے مرزا صاحب کی ضلالت وبطالت ظاہر ہو جائے گی اور نیز ان کے پچھلے رسالوں کے نمبر صفحہ کے حوالوں سے درج کیا گیا۔ چنانچہ ص ۱۸ ر توضیح المرام، اور صفحہ ۱۹۲، ۱۹۷، ۶۷۵، ۶۶۸، ۶۷۹، رسالہ ازالہ اوہام سے صاف صاف ان کا دعویٰ نبوت ورسالت متحقق ہے۔ پھر حضرت مسیح کی اکثر اور حضرت موسیٰؑ کی بعض پیش گوئیوں کو غلط لکھا ہے۔ ۶، ۷ و ۸ صفحہ ازالہ میں دیکھو اور حضرت مسیح وسلیمان کے معجزوں کو شعبدہ بازی اور بے سود اور عوام کو فریفتہ کرنیوالے درج کیا ہے۔ اسی ازالہ کے ص ۳۰۲ میں دیکھو اور چار سو نبی کو جھوٹا لکھ دیا، اور ان کی وحی میں دخل شیطان ثابت کرلیا۔ اسی ازالۃ الاوہام کے صفحہ ۶۲۷ سے ۶۲۹ تک دیکھو اور حضرت مسیح کی وفات کے اِدّعا میں قرآن مجید کی آیتوں میں تحریف کر کے کمال دھوکہ دہی کی ہے۔ جدول مندرجہ صفحہ ۳۳۰ سے ۳۳۲ میں اسی ازالہ کے دیکھو، اس اشتہار پر بھی نہ خود مدعی مسیحیت کو نہ ان کے کسی مرید کو غیرت دامن گیر ہوئی کہ محض علماء میں اپنی بریت کرتے یا اس کا جواب شافی دیتے۔ سچ ہے: الحیاء من الایمان ! پھر ربیع آخر ۱۳۱۱ھ میں جو مرزا صاحب اپنے جدید سسرال کے ہاں چھاؤنی فیروز پور میں آئے تو کئی مسلمانوں نے ان سے دعویٰ مسیحیت کا ثبوت طلب کیا۔ اس پر مرزا صاحب نے مختصر تقریر کے بعد جواب دیا کہ کسی عالم کو ہمارے پاس لے آؤ ہم ان کی تسلی کر دیں گے۔ پھر جلدی سے قادیان کو سدھارے۔

دوسری مرتبہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ کو جب وہاں آئے تو فقیر کو وہاں کے بعض اہل اسلام نے تحقیق حق کے لئے بلایا۔ فقیر نے وہاں جا کر ان کی مذکورہ بالا تصانیف سے ان کا دعویٰ نبوت توہین انبیاء وغیرہ سب کو دکھلایا۔ چنانچہ ان کے سمجھ میں آیا۔ اس پر انہوں نے

مرزا صاحب سے فقیر کے ساتھ تقریر کرنے کی درخواست کی جس پر جواب ملا ہم کو الہام ہوا ہے کہ مولویوں سے مباحثہ نہ کریں۔ تب لوگوں نے کہا کہ آپ کے کہنے سے ہم نے بلوایا تھا۔ آخرش بعد تکرار بسیار مرزا صاحب نے بذات خود مناظرہ سے اور اپنے شاگرد و مرید حکیم نورالدین و محمد احسن امروہی سے بھی درمیان میں بیٹھ کر مباحثہ کرانے سے انکار کیا۔ اس پر چھاؤنی فیروز پور کے پچیس معتبر اہل اسلام کی شہادت سے مطبع صدائے فیروز پور میں اشتہار شائع ہوا کہ مرزا صاحب مدعی نبوت ہیں اور انبیاء کرام کے توہین کنندہ اور جواب دینے سے سے صریح گریز ہے۔ اس پر جب ان کے سخت مخلص حافظ محمد یوسف مذکور کو یہ شکست فاش ناگوار معلوم ہوئی تو پھر وہاں جا کر دوسری مرتبہ مرزا صاحب کو مناظرہ میں شامل ہونے کے لئے آمادہ کیا اور امرتسر سے بنام مولوی محمد حسن امروہی اشتہار جاری کیا کہ مکفرّین مرزا صاحب دسمبر کی تعطیلوں میں لاہور میں آکر مناظرہ کریں ۔میں مشتہر یا حکیم نورالدین صاحب مناظرہ کریں گے۔

اس پر فقیر نے مرزا صاحب سے اقرار شمول جلسۂ مناظرہ کا بذریعہ خط رجسٹری لیکر دو روز قبل از تاریخ مقررہ وارد لاہور ہو کر دس دن برابر لاہور میں رہا۔ نہ مرزا صاحب آئے نہ دونوں مناظر حاضر پائے۔ حکیم فضل الدین و برہان الدین مناظرہ کو آئے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ مرزا صاحب کا مختار نامہ لے آئیں، فقیر حاضر ہے۔ پھر آج تک ان کی طرف سے صدائے برنخاست!

اب اللہ تعالیٰ سے سرخرو ہونے کو یہ رسالہ شائع کیا گیا ہے۔ عنقریب اس کا دوسرا حصہ فتح اسلام و توضیح مرام و ازالۃ الاوہام کی بعض سخت قباحتوں کی تردید جن کا ذکر اوپر گذرا ہے، شائع ہوگا۔ وماتوفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت وعلیہ انیب ....المرقوم

۱۸ صفر ۱۳۱۲ھ

زوال کی داستان......تاریخ کا ایک ورق

سلطان عمران

ہسپانیہ میں ابن الاحمر کے جانشین کئی مرتبہ گرے اور سنبھلے۔کبھی عیسائیوں سے صلح ہو جاتی۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگتے کبھی پھر جنگ چھڑ جاتی اور عیسائی دیگا کے میدان تک ہلہ بول دیتے یا مسلمان ان کے علاقے میں گھس کر مار دھاڑ کر دیتے ۔اسی طرح دوسو سال سے اوپر ہو گئے اس عرصہ میں مسلمانوں کی سلطنت نہ بڑھی نہ گھٹی بلکہ اتنی کی اتنی رہی لیکن شجر اقبال کو گھن لگ چکا تھا اور سلطنت کی ظاہری شان وشوکت میں زوال اور بے اقبالی کے آثار جھلکتے نظر آتے تھے پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ غرناطہ کے بادشاہ کو کیسٹائل کے عیسائی بادشاہ سے دب کر صلح کرنا پڑی اور اس نے بارہ ہزار دینار سالانہ خراج منظور کر لیا۔

ان دنوں اراگون عیسائیوں کی ایک مشہور ریاست تھی ۔وہاں کے سردار نے اپنی بیٹی ازبیلا کیسٹائل کے شہزادہ فرڈینڈ کو بیاہ دی اور اس طرح یہ دونوں ریاستیں الگ ہو گئیں ۔ازبیلا اور فرڈینڈ دونوں کے دل مذہبی جوش کے ساتھ ساتھ ملک گیری کے شوق سے معمور تھے اس لیے ان کی نظریں بار بار غرناطہ کی طرف اٹھ جاتی تھیں ۔ادھر غرناطہ کے تخت سلطنت پر ابوالحسن علی جیسا بہادر جنگجو شخص متمکن تھا جس کے دل میں شہزادگی کے زمانے سے عیسائیوں کے ساتھ قوت آزمائی کرنے کی آرزو موج مار رہی تھی۔ چنانچہ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی خراج دینے سے انکار کر دیا۔

عیسائی بادشاہ نے ایلچی بھیجا تو ابوالحسن نے اس کی باتیں سن کر کہا اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ خراج دینے والے مر گئے ۔اب غرناطہ کی ٹکسال میں اشرفیوں کے بدلے تلواریں ڈھلتی ہیں۔ ایلچی ابھی یہ جواب لے کر اپنے آقا کے پاس نہیں پہنچا تھا کہ ابوالحسن فوج لے کر زاہراہ کے شہر پر جا چڑھا۔ اندھیری رات تھی اور تین دن سے لگا تار بارش ہو رہی تھی ۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں سوئے پڑے تھے ۔قلعہ کے پہرہ دار بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑ کے محفوظ جگہ میں دبکے ہوئے تھے ۔مسلمان کمندوں کے سہارے فصیل پر جا چڑھے۔

بہت سے لوگ مارے گئے ۔جو باقی بچے انہیں قید کر کے غرناطہ پہنچا دیا گیا۔ابوالحسن کی یہ

حرکت غرناطہ کے لوگوں کو بھی نہ پسند آئی چنانچہ ایک بزرگ نے صاف صاف کہہ دیا کہ زاہراہ کے بے گناہوں کا خون رائیگاں نہ جائے گا۔ اندلس کی اسلامی حکومت اب دنوں کی مہمان ہے۔

اب عیسائی فوجیں ہر طرف سے یلغار کرتیں ہوئیں بڑھیں اور بڑے زور شور سے جنگ شروع ہوئی۔ ابوالحسن نے غرناطہ سے نکل کر ایک ٹکر کو روکا لیکن اس کا بیٹا ابوعبداللہ جسے وہ قوت بازو سمجھا تھا عین وقت پر بگڑ بیٹھا۔ اصل میں ابوالحسن کی دو بیویاں تھیں۔ ایک تو اس کی چچا کی لڑکی عائشہ دوسری زہرہ جو اندلس کے ایک مشہور عیسائی خاندان سے تھی۔ ابوالحسن زہرہ اور اس کی اولاد کو بہت پیار کرتا تھا۔ جلاپے کی ماری عائشہ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا بیٹے کو باپ کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ اس نے کچھ سرداروں کو ساتھ ملا کے خزانے پر قبضہ کر لیا اور باپ کو ایسا نقصان پہنچایا کہ وہ بیچارہ بھاگ کر اپنے بھائی الزاغل کے پاس جو ان دنوں ملاغہ کا حاکم تھا چلا گیا۔

ادھر فرڈیننڈ اور ازبیلا نے ملاغہ کی فتح کے لیے ایک زبردست فوج بھیجی۔ اس فوج نے اس طرف سے اکثر بستیوں کو خوب لوٹا کھسوٹا۔ گھروں کو آگ لگا دی، کھیتوں اور باغوں کو ویران کر دیا لیکن یہ علاقہ کوہستانی ہے۔ عیسائی فوج ادھر کے پہاڑوں میں ایسی پھنسی کہ نکل نہ سکی۔ بہت سے عیسائیوں کو دیہاتیوں نے جو گھر بار چھوڑ کر ان پہاڑوں کی کھوہوں میں جا چھپے تھے پتھر لڑھکا لڑھکا مار ڈالا۔ ابھی اس مصیبت سے نجات نہیں ہوئی تھی کہ بہادر الزاغل جو انہیں روکنے ملاغہ سے چلا تھا آ پڑا۔ اس معرکہ میں عیسائیوں پر بڑی تباہی آئی اور ان کے کئی نامی گرامی شہسوار مارے گئے جو باقی بچے پہاڑوں میں سر ٹکراتے پھرے۔

الزاغل کے اس کارنامے کی خبر غرناطہ پہنچی تو ابوعبداللہ جو باپ چچا سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا عیسائی پر چڑھائی کر دی لیکن بدنصیبی ہمیشہ سے اس کے ساتھ تھی شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ فرڈیننڈ اور ازبیلا نے اس سے بڑا اچھا سلوک کیا اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اس نے عیسائیوں کی اطاعت قبول کر لی اور باپ کو غرناطہ سے نکال کر پھر تخت جا بیٹھا۔ ابوالحسن بیٹے کی ان حرکتوں سے ایسا بیزار ہوا کہ تخت و تاج اپنے بھائی الزاغل کے حوالے کر کے ایک محفوظ مقام پر چلا گیا اور تھوڑے دنوں میں وہیں انتقال کیا۔

اب اندلس کی حکومت کے دو حریف رہ گئے تھے ابوعبداللہ اور الزاغل۔ الزاغل کی شجاعت

میں تو کوئی کلام نہیں لیکن اس پر دو طرف سے دباؤ پڑا ہوا تھا۔ایک طرف سے ابو عبداللہ بڑھا چلا آتا تھا دوسری طرف عیسائیوں کے حملے دم نہ لینے دیتے تھے۔ آخر اس نے مجبور ہو کر ابو عبداللہ کو خط لکھا جس میں جگر کا خون حرفوں کی صورت ٹپکایا گیا تھا۔خط کا مضمون یہ تھا کہ اس نازک وقت میں جبکہ دشمن سر پر ہے اور یہ سلطنت جس پر تم بیٹھے ہوئے ہو چند دن کی مہمان نظر آتی ہے۔ آپس میں لڑنا جھگڑنا ٹھیک نہیں آؤ ہم تم مل کے پہلے عیسائیوں کا مقابلہ کرلیں پھر آپس میں نبٹ لیں گے لیکن ابو عبداللہ کا دل پھر بھی نہ پسیجا۔

اگرچہ الزاغل نے سپہ گری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جو تھوڑی سی فوج اس کے پاس تھی وہ بھی خوب خوب لڑی لیکن عیسائی فوج بے شمار تھی۔

کئی قلعے ایک ایک کر کے چھن گئے اور دشمن نے بڑھ کر ملاغہ کو گھیر لیا۔عیسائی کئی مرتبہ یورش کرتے ہوئے ملاغہ کی فصیل پر پہنچ گئے لیکن مسلمانوں انہیں پیچھے ہٹا دیا۔بعض جانبازوں نے کمندوں سیڑھیوں کے سہارے فصیل پر چڑھنا چاہا لیکن ادھر سے بھاری پتھر لڑھکائے گئے ساتھ ہی قلعہ کے برجوں سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی اور عیسائی پسپا ہو گئے ۔ جب یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں تو عیسائیوں نے سرنگوں سے فصیل کو اڑا دینے کی کوشش کی لیکن اس طریقہ سے بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی۔اسی زمانہ میں ازبیلا مکی فوج لے کر پہنچی۔اسے دیکھ کر عیسائیوں کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ گئیں اور وہ بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگے۔

انہیں دنوں ایک اور آفت نمودار ہوئی جس نے مسلمانوں کی کمر بالکل توڑ دی یعنی شہر میں قحط پھیل گیا۔عیسائیوں نے سارے راستے بند کر رکھے تھے کہیں سے رسد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ الزاغل کو معلوم ہوا تو تھوڑی سی فوج ساتھ لے کر ملاغہ والوں کو کمک کو چلا لیکن ابو عبداللہ نے راستہ روک کر اس کی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ جب ملاغہ کے حاکم کو باہر سے کوئی امید نہ رہی اور ادھر لوگوں نے شور مچایا کہ اب ہم سے بھوک پیاس کی سختی نہیں جھیلی جاتی تو مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور عیسائی فتح مندوں نے شہر میں داخل ہو کر سارے مسلمانوں کو غلام بنالیا۔

کہتے ہیں کہ جب ابو عبداللہ کے پاس ملاغہ کی فتح کی خبر پہنچی تو اس نے فرڈیننڈ کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

امام، زاہد، عابد، محدث، فقیہہ، علم کا پہاڑ، ثقہ اپنے زمانے کی لاثانی شخصیت ابونصر بن حارث بن عبدالرحمٰن مروزی بغداری جوکہ بشر حافی کے نام سے مشہور تھے۔

ولادت اوروفات

ان کی ولادت مرو میں سن ۱۵۰ میں اور وفات ۲۲۸ میں ہوئی۔ بغداد اترے پھر اسی کو وطن بنالیا۔

اساتذہ:

اپنے شہر بغداد اور دیگر شہروں میں بہت سے اساتذہ سے حدیث سنی، جن میں حماد بن زید، عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی، مالک بن انس سے دوران حج اور ابوبکر بن عیاش، فضیل بن عیاض اور دیگر اساتذہ سے حدیث کا سماع کیا۔

تلامذہ:

ان سے روایت کرنے والوں میں سے بڑے بڑے علماء ہیں۔ جن میں امام احمد بن حنبل، ابراہیم حربی، زہیر بن حرب، سری سقطی، عباس بن عبدالمظعم، محمد بن حاتم اور دیگر جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔

علمی کمال، زہدوتقویٰ اور عبادت

آپ نے زندگی بھر حدیث سنی اور سنائی، راویوں کی تعدیل وجرح توثیق وتضفیف میں مشغول رہے، آخر میں لوگوں سے کنارہ کش ہوکر عبادت میں مشغول ہوگئے اور حدیث کی مشغولیت ترک کردی۔ زہد عبادت تقویٰ اور ورع میں ایک یادگار بن کر رہ گئے۔ بہت سے ائمہ نے ان کی عبادت، زہد پھٹے پرانے کپڑے اور تقویٰ کی مدح سرائی کی ہے۔

ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ روٹی کس چیز کے ساتھ کھاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا ''اللہ کی عطا کردہ عافیت کو یاد کر کے اسی کا سالن بنالیتا ہوں۔''

۷۵ سال کی عمر میں دنیا سے رحصت ہوگئے.........

احمد بن ماہان کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل سے تقویٰ سے متعلق کسی مسئلے کے بارے میں پوچھا گیا

توانہوں نے کہا کہ استغفر اللہ میں تقویٰ کے متعلق کیسے گفتگو کرسکتا ہوں جب کہ میں بغداد کے غلے سے کھاتا ہوں اگر بشر بن حارث ہوتے تو وہ اس لائق تھے کہ تمہیں جواب دیتے کیونکہ نہ تو وہ بغداد کے غلے سے کھاتے تھے اور نہ ہی عام لوگوں کے کھانے میں سے۔

حسن بن محمد بن اعین کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر بشر اوران کی ہمارے لیے استغفار نہ ہوتی تو ہم بیکار ہوتے۔

حسن بن لیث رازی کہتے ہیں کہ امام احمد سے کہا گیا کہ بشر بن حارث آپ کی طرف آنا چاہتے ہیں توا نہوں نے فرمایا کہ شیخ کو تکلیف نہ دو ہم اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ ہم جائیں۔

ابو بکر مروذی کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ کو بشر بن حارث کا تذکرہ کرتے ہوئے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ بشر بن حارث میں ایک اُنس تھا۔ پھر فرمایا کہ میں کبھی ان سے بات نہیں کرسکا (عبدا لفتاح کہتے ہیں کہ) امام احمد کے اس کلام کا معنی یہ ہے کہ وہ بشر بن حارث سے بات کرنے کے بجائے صرف ان کی صحبت، دیدار اوران کی مجلس کی خوشبو سونگھنے پر ہی اکتفاء کرتے تھے۔

امام احمد اور بشر حافی ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

اذاسکو راء یت لھم جما لا　　　　وان نطقوا سمعت لھم عقولا

ترجمہ: ''خاموشی کے وقت تم ان میں ایک جمال دیکھو گے اور جب وہ گفتگو کریں تو تم عقلمندی کی باتیں سنو گے''۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ بشر چونکہ تنہا تھے، ان کی اولاد نہ تھی، اس لیے وہ عبادت، زہد، تقویٰ اور فضائل عالیہ میں اس قدر قوی تھے۔ ورنہ عیال دار اور تنہا شخص مجرد شخص برابر نہیں ہوسکتے۔ اگر میں ایسا ہوتا تو مجھے بھی اپنے کھانے پینے کی کوئی پرواہ نہ ہوتی، لیکن لوگ اگر شادی کرنا چھوڑ دیں تو دشمن سے دفاع کرنے والا کون ہوگا؟ بچے کا باپ کے سامنے غصے اور رونے کی حالت میں روٹی مانگنا کتنے ہی فضائل حاصل کرنے سے بہتر ہے۔ ایسے عیال دار شخص کے ساتھ شادی نہ کرنے والے عبادت گزار کو کیسے جوڑا جاسکتا ہے؟

بشر کی وفات کی خبر سن کر امام احمد بن حنبل نے فرمایا، ایسا شخص ہم سے رخصت ہوا جس کی عامر بن عبد قیس کے علاوہ اس امت میں کوئی نظیر نہ تھی۔ اگر وہ شادی کر لیتے تو کامل اور بعد میں آنے والے لوگوں میں لاثانی ہوتے۔

محمد بن مثنٰی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے پوچھا کہ آپ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہوں نے پوچھا کون سا شخص؟ میں نے کہا بشر حافی تو انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو زمین پر نیزہ گاڑ کر اس کی نوک پر بیٹھ جائے۔ تو کیا اس نے اس میں کسی اور کے لیے بیٹھنے کی جگہ چھوڑی ہے؟ ان پر زہیر بن ابی اسلمی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

سعی بعدھم قوم لکی یدر کوھم   فلم یفعلو اولم یلاموا ولم یاء لوا

ان کے بعد کچھ لوگوں نے ان کے مراتب عالیہ کو پانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، اس ناکامی پر ان کو ملامت نہیں کی گئی اور انہوں نے ان کے مراتب کے پانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

عبدالفتاح کہتے ہیں کہ بشر کے شاگرد امام ابراہیم حربی جو کہ امام احمد کے ہم پلہ تھے۔ اپنے استاذ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو کچھ ان کے بارے میں کہا گیا ہے، میرا خیال نہیں کہ کسی اور عاقل کے بارے میں کہا گیا ہو۔

انہی کا قول ہے کہ بغداد نے بشر حافی سے زیادہ عقلمند اور ان سے زیادہ زبان کی حفاظت کرنے والا کوئی اور نہیں پیدا کیا۔ انہوں نے کبھی کسی مسلمان کی غیبت نہیں کی۔ ان کا بال بال عقلمندی سے معمور تھا۔ ان کی عقل میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ ان کے علم، دینداری اور تقویٰ کی وجہ سے پچاس سال تک لوگ ان کے پیچھے چلتے رہے۔

خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ بشر حافی اپنے معاصرین پر تقویٰ اور زہد میں فائق تھے۔ وفور عقل بہت سے فضائل، اچھی سیرت، مذہب پر استقامت، نفس کی بات نہ ماننے اور لایعنی کاموں سے دور رہنے میں وہ یکتا تھے۔ کثیر الحدیث تھے لیکن روایت کے مسند نشیں نہ تھے جو کچھ بھی ان سے روایت کے باب میں سنا گیا وہ بطور مذاکرہ کے تھے۔

حافظ دار قطنی فرماتے ہیں کہ بشر بن حارث، زاہد اور علم کے پہاڑ تھے۔ صرف صحیح حدیث روایت ،کرتے تھے۔ ان کی روایات میں آفت اکثر ان کے اساتذہ سے آئی ہے۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ بشر حافی کی جب وفات ہوئی تو بغداد کے تمام لوگ ان کے جنازے میں جمع ہوگئے۔ فجر کے بعد ان کا جنازہ اٹھایا گیا لیکن رش کی وجہ سے تدفین عشاء کے بعد ممکن ہوسکی۔ اور دن بھی لمبا اور گرم بھی تھا۔ یحییٰ بن عبدالحمید حمانی کہتے ہیں کہ میں نے ابونصر تمار اور علی بن مدینی کو بشر کے جنازے میں چیختے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہے تھے۔ بخدا! آخرت کے عزت واکرام سے پہلے یہ دنیا میں ان کا اکرام ہے۔

ذہبی کہتے ہیں کہ بشر حافی کا جنازہ بہت بڑا تھا۔ ان کا جنازہ گھر سے صبح نکالا گیا اور تدفین اژدھام کی وجہ سے رات کو ہوئی۔

بشر کے تذکرہ میں میں نے تھوڑی سی طوالت اس لیے کی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ ہے کہ بشر حافی ایک صوفی، درویش اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ایک صالح انسان تھے حالانکہ وہ امت کے بڑے بڑے عقلمند اور صلحاء میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو۔

شعروسخن

چھا رہی ہے گھٹا مدینے کی

حضرت سید نفیس الحسینی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

چھا رہی ہے گھٹا مدینے کی　　آ گئی رُت پلانے پینے کی
نہیں حسرت زیادہ جینے کی　　زندگی چاہیے قرینے کی
زندگی اُس کی، مَوت اُس کی ہے　　خاک ہو جائے جو مدینے کی
رات دن شغلِ بادہ خواری ہے　　رَمَضاں عید ہے مہینے کی
مَۓ افرنگ میں وہ بات کہاں　　لا مِرے واسطے مدینے کی
ساقیا چھوڑ ساغر و مینا　　اب پِلا دل کے آبگینے کی
ختم ہے سِلسلہ نبوّت کا　　مُہر ہے ہاشمی نگینے کی
ہفت اِقلیم سے ہے بیش بہا　　خاک چُٹکی سی اِک مدینے کی
ہفت قلزم کے موتیوں سے گراں　　بُوند اِک اِک ترے پسینے کی

ننگِ اولادِ مصطفٰے ہے نفیسؔ
لاج رکھ لے خُدا کمینے کی

ان کا کلام شرح ہے ام الکتاب کی

سید امین گیلانی رحمہ اللہ

خوشبو جو آرہی ہے دہن سے گلاب کی
میں مدح کررہا ہوں رسالتؐ مآب کی

چہرہ جب ان کا میرے تصور میں آگیا
آنکھوں میں بس گئی ہے ضیا ماہتاب کی

بخشش کا ، ان کی چشم کرم پر ہے انحصار
کچھ حیثیت نہیں ہے گناہ وثواب کی

امید کیوں نہ رکھوں وہ ہیں رحمت تمام
رکھ لیں گے لاج وہ مری چشم پر آب کی

امی لقب کے علم کی اللہ رے یہ شان
ان کا کلام شرح ہے ام الکتاب کی

دیکھا جسے حضورؐ نے ایسا لگا اسے
دل میں اتر گئی ہے کرن آفتاب کی

محبوب چن لیا جو خدا کے حبیب ﷺ کو
دیتا نہ کیوں وہ داد مرے انتخاب کی

لے لے ان کا نام تڑپتا ہوں رات دن
لذت نہ آپ پوچھیں مرے اضطراب کی

چپ چاپ ان کے در پہ میں بیٹھا رہا امینؔ
ہمت کہاں تھی مجھ میں سوال وجواب کی

نعت

اِک ذات کہ جو گنبد خضراء میں مکیں ہے
اللہ کی تخلیق میں وہ اعلیٰ تریں ہے
ڈھونڈے سے بھی مل پائے نہ ایسی کہیں صورت
دنیا کے مصور کے تصور سے حسیں ہے
ہیں ان ہی کی تخلیق میں اللہ کے اخلاق
اوصاف میں ان جیسا کوئی تھا نہ کہیں ہے
وہ روضے کی چوکھٹ ہے فقط عشق کا زینہ
ہے عشق کی منزل جو وہاں پردہ نشیں
ہو ہم بھی فقیروں کو کبھی ان کی زیارت
اللہ کی قدرت میں کمی کوئی نہیں ہے
ہو ان پہ درود اور سلام اپنی طرف سے
ہاں ان کے تقرب کا یہی ایک قریں ہے
مسلم ہی نہیں غیر بھی ان کے ہیں ثناء خواں
اغیار کا اخیار کا سب ان پہ یقیں ہے
دنیا کے حسیں حُسنِ محمد ﷺ کا ہیں صدقہ
اس حسن کے ہر عکس سے ہر ماہ مبیں ہے
حسرت ہے کروں جا کے حبیبؔ اس کی گدائی
جس ذات کے قدموں میں مری خُلدِ بریں ہے

ابن انیس حبیب الرحمٰن لدھیانوی

پیارا

مولانا منیب الرحمٰن لدھیانوی

مکہ بھی پیارا ہے مدینہ بھی پیارا
دونوں کی محبت ہے عقبیٰ کا سہار
اک قبلہ عبادت ہے اک قبلہ اطاعت
مومن کو ہے لازم دونوں کا نظارہ
وہ مولدِ محبوب ہے یہ مخزن محبوب
دونوں ہی مقاموں کا وہی راج دلارا
بوبکر وعمر اور عثمان وعلی بھی
محبت آقا کا یہی چارہیں چارہ
محبت نہیں جنکو یاران نبی سے
ایمان سے خالی ہے وہ مردود بیچارہ
عقیدہ توحید کی بنیاد ہے کعبہ
اور اس کی اشاعت کا یثرب ہے نقارا
جس دل میں نہیں عشق دونوں سے منیبؔ
وہ سنگِ گراہ ہے وہ قسمت کا ہے مارا
آیا ہوں بڑی دور سے اک آس یہ لیکر
للہ یہ کہہ دیں کہ تو بھی ہے ہمارا

خواتین کے صفحات

خادمۃ القرآن

حضرت فاطمہؓ کا گھر

حضورﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کے گھر کا سامان کیا تھا اور کتنا تھا؟۔آپ کے پاس سونے کے لیے اچھا بستر تک نہ تھا اور رات کے الگ کپڑے تک ان کے پاس نہ تھے حضرت علی نے یہ بات برسر منبر بیان کی:

''جب میری شادی ہوئی تو بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ہمارے پاس رات کو سونے کے لیے بکری کی ایک کھال تھی رات یہ ہماری خواب گاہ ہوتی اور دن میں ہم اسے اپنی سواری کے جانور کو چارہ ڈالنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔'' (طبقات ج۸ص۱۸)

حضرت سیدہ فاطمہؓ کی گھریلو زندگی

حضرت سیدہ فاطمہؓ گھر کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔چکی بھی اپنے ہاتھوں سے پیسا کرتی تھیں اس سے آپ کے ہاتھوں میں اکثر چھالے بھی پڑ جاتے،آپ خود ہی مشک میں پانی بھی بھر کر لایا کرتی تھیں اور حضرت علی بھی دور سے پانی بھر لایا کرتے تھے اور اس سے ان کو بھی تکلیف ہوتی تھی اور آپ گھر کی صفائی اور اپنے شوہر نامدار کی خدمت گزاری کے علاوہ عبادت بھی کثرت سے کرتی تھیں۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''حضرت فاطمہ چکی چلاتی تھیں۔چکی چلاتے چلاتے اور آٹا پیستے ان کے ہاتھ پر نشان تک پڑ گئے تھے اور مشک میں پانی بھر بھر کر لانے میں ان کا سینہ درد کرنے لگا تھا اور گھر میں جھاڑو دیتی اس سے ان کے کپڑے بھی غبار آلود ہو جاتے تھے''۔

(سنن ابی داؤد ج۲ص۴)

شیعہ عالم شیخ ابو جعفر بن بابو یہ قمی لکھتے ہیں کہ حضرت علی نے بنی سعد کے ایک شخص سے کہا:

''حضرت فاطمہ میری اہلیہ تھیں اور وہ حضورﷺ کو اپنے تمام گھر والوں میں بہت عزیز تھیں اس کے باوجود گھر کے سارے کام خود کرتی تھیں مشک میں پانی بھر لاتیں، چکی چلاتیں حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ان کے کپڑے صفائی کرنے کی وجہ سے گرد و غبار میں آلودہ ہو جاتے اور چولہا جھونکنے کی وجہ سے ان کے کپڑے میلے ہو جاتے تھے اس پر میں نے ان سے کہا کہ وہ حضورﷺ کے پاس جائیں اور آپﷺ سے کوئی خادمہ مانگ کر لائیں تو ان کے لیے کچھ سہولت ہو جائے تو وہ حضورﷺ کے پاس آئیں۔

☆......حضرت فاطمہؓ کی معاشی حالت

حضرت علی مرتضیٰ مالدار نہ تھے اور حضرت فاطمہؓ کے پاس بھی مال و دولت نہ تھا دونوں میاں بیوی نے ہمیشہ صبر و شکر اور فقر و فاقہ کی زندگی گزاری کھانا ملا کھا لیا نہ ملا تو صبر کر لیا۔ حضرت علیؓ محنت کر کے کچھ رقم لاتے تو اس سے میاں بیوی اپنا گزارہ کر لیتے ورنہ کئی کئی وقت دونوں فاقے سے ہوتے تھے حضرت علیؓ مرتضی فرماتے ہیں:

ہم پر ایسے کئی دن گزرے کہ ہمارے گھر میں کوئی چیز کھانے کی نہ تھی اور نہ ہی حضورﷺ کے پاس کچھ تھا ان دنوں میں باہر نکلا تو راہ میں ایک دینار پڑا ہوا دیکھا

میں ٹھٹھک رہ گیا دل میں سوچتا رہا کہ کہ ایس اٹھاؤں یا چھوڑ دوں؟ لیکن افلاس کی شدت نے مجھے اس کے اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

چنانچہ میں نے اسے اٹھا لیا اور اس سے کچھ آٹا خرید لیا اور حضرت فاطمہ کو دیا کہ روٹی پکا دیں وہ آٹا گوندنے لگیں مگر ان پر بھی فاقہ کا اس قدر اثر تھا کہ آٹا گوندھنے میں ہاتھ بار بار برتن پر گر جاتا تھا اور چوٹ لگتی حضرت فاطمہ نے بڑی مشقت سے روٹی پکائی، پھر میں نے حضورﷺ سے آ کر یہ سارا واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا:

''اللہ نے تمہیں یہ رزق پہنچایا ہے''۔

کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ دینار ایک خاتون کا تھا اور وہ تلاش کرتی آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے دینار دے دو۔

ایک مرتبہ گھر میں کئی وقت کا فاقہ تھا حضرت علیؓ کہیں سے ایک درہم کما لائے اور گیہوں خرید کر گھر آئے، حضرت فاطمہؓ نے اسی وقت گیہوں چکی میں پیسے اس کی روٹی پکائی اور اپنے شوہر کے سامنے رکھ دی، جب وہ کھا چکے تو پھر حضرت فاطمہؓ کھانے بیٹھیں۔

حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز حضور ﷺ گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے بچے کہاں ہیں؟ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ آج صبح اٹھے ہیں تو گھر میں کوئی ایک چیز بھی کھانے کو نہ تھی تو حضرت علیؓ نے کہا کہ ان دونوں کو باہر لے کر چلا جاتا ہوں اگر گھر پر رہیں گے تو روئیں گے اور تمہارے پاس کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے کہ

انہیں کھلا کر خاموش کرا سکو چنانچہ حضور ﷺ انہیں تلاش کرتے ہوئے ایک جگہ پہنچے تو دیکھا کہ دونوں بچے ایک صراحی سے کھیل رہے ہیں اور ان کے سامنے ایک آدھا کھجور پڑا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی سے کہا کہ اب بچو کو گھر لے کر چلو دھوپ بڑھ رہی ہے۔

انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ تھوڑی دیر تشریف رکھیں آج صبح سے ہمارے ہاں ایک کھجور کا دانہ نہیں ہے میں فاطمہ کے لیے کچھ بچے کھچے کھجور جمع کرلوں چنانچہ حضور ﷺ بیٹھ گئے اور حضرت علیؓ نے کچھ کھجور جمع کر لیے پھر حضرت علیؓ نے دونوں بچوں کو گود میں اٹھایا اور گھر آئے (الترغیب والترھیب ج ۵ ص ۱۔ المرتضی ص ۲۲)

ایک مرتبہ آپ بیمار تھیں حضور ﷺ ان کی عیادت کے لیے آئے اور پوچھا کہ بیٹی اب کیا حال ہے؟ حضرت سیدہ فاطمہؓ نے کہا کہ مجھے درد ہے اور یہ تکلیف زیادہ اس بھی لیے ہے کہ کہ میرے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے اس پر فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو جہانوں کے عورتوں کی سردار ہو انہوں نے پوچھا کہ کہ پھر حضرت مریم بنت عمران کا کیا ہوگا؟ فرمایا کہ وہ اپنے دور کی عورتوں کی سردار اور تو اپنے دور کی عورتوں کی سردار۔ اور بیٹی بخدا میں نے تیرا نکاح ایسے شخص سے کیا

جو دنیا و آخرت میں سردار ہے۔(استیعاب ج ۴ ص ۳۷۲)

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ انکے پاس اتنا بڑا دوپٹہ بھی نہیں کہ اس سے پورے بدن کو ڈھانک سکیں سر ڈھانکتی تو پیر نظر آتے اور پیر چھپاتی تو سر کھل جاتا (طبقات ج ۸ ص ۲۱ فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۴۵)

عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مرتبہ حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر آنے کی اجازت مانگی حضرت فاطمہ نے کہا کہ آپ کے ساتھ اور بھی کوئی ہے؟

آپ نے کہا ہاں۔ حضرت سیدہ نے کہا کہ ابا جان میرے پاس اس وقت سوائے ایک چادر کے اور کچھ نہیں ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اپنی چادر بڑھا دی اور کہا کہ اسے سر پر اوڑھ لو ......حضرت جابر کہتے ہیں کہ جب ہم واپس لوٹنے لگے تو لوگوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اس حال میں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جان لو کہ فاطمہ قیامت کے دن عورتوں کی سردار ہے (حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۵۲۔ کنز العمال)

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملنے آئے تو دیکھا کہ حضرت سیدہ نے اونٹ کی کھال کا لباس پہنا ہوا ہے اور اس میں دس سے زیادہ مقام پر پیوند لگا ہوا تھا اور آپ روٹی پکاتے ہوئے اللہ کا ورد کر رہی تھیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ حضرت سیدہ فاطمہ کے افلاس کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھی بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی ہر صبح شام تھا

بچوں کے صفحات

بدلہ

ایک ظالم سپاہی نے ایک درویش کے سر پر پتھر مارا۔ وہ صاحب اختیار تھا۔ طاقتور تھا۔ درویش میں بدلہ لینے کی ہمت نہ تھی خاموش رہا۔لیکن وہ پتھر سنبھال لیا جو سپاہی نے اس کے سر پر مارا تھا۔ظلم خدا کو پسند نہیں۔ جو ظالم سے ظلم کا بدلہ نہ لے سکے خدا ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس ظالم سپاہی پر خدا کا قہر نازل ہوا۔ بادشاہ کسی بات پر اس سے ناراض ہوگیا۔اسے ایک کنویں میں قید کر دیا۔تو اتفاق سے ایک دن وہی درویش اس کنویں کے قریب سے گزرا۔جس میں ظالم سپاہی قید تھا۔

درویش نے اپنے دشمن کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے تھیلے سے وہی پتھر نکالا اور ظالم سپاہی کے سر پر دے مارا۔

سپاہی درد سے بلبلایا اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولا۔

”تو نے مجھے ناحق پتھر کیوں مارا؟“

درویش نے جواب دیا۔

”میں نے تجھے ناحق پتھر نہیں مارا۔ یہ وہی پتھر ہے جو فلاں تاریخ کو تو نے میرے سر پر مارا تھا“۔

سپاہی نے غصے میں کہا۔

”کیا تجھے آج ہی بدلہ لینا یاد آیا۔اتنی مدت کہاں رہا؟“

درویش نے جواب دیا۔

”تم سے بدلہ لینے کی ہمت نہ تھی۔آج تم کو کنویں میں قید پا کر غنیمت جانا کہ عقل مندوں نے کہا ہے۔

دیکھے نالائق کو جب تو بااختیار
عاقلوں کی طرح کر صبر اختیار
تیز تر ناخن جو رکھتا نہیں
وہ بدوں کے ساتھ بس لڑتا نہیں
جو کوئی شہ زور سے پنجہ ملائے
ناتواں پنجے سے اپنے ہاتھ اٹھائے
جبکہ اس کے ہاتھ باندھے آسماں
تب نکال اس کا تو مغز استخواں

تلقین:۔

حضرت سعدیؒ نے اس حکایت میں انتقام کی اہمیت اجاگر کی ہے۔کسی کی زیادتی پر درگزر کرنا اور معاف کر دینا فرشتوں کی صفت ہے۔

لیکن اخلاق کی رو سے دشمن سے بدلہ لیا جائے۔اس سے ظالم کی حوصلہ شکنی اور دیکھنے والوں کو عبرت ہوگی۔

بہادر لڑکا

ایک بادشاہ ایک ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگیا کہ شاہی حکیم کے پاس انسان کے اپنے پتے کے سوا کوئی علاج نہیں اور اس انسان میں یہ بھی نشانیاں پائی جاتی ہوں۔

بادشاہ کے حکم سے ایسے انسان کی تلاش جاری ہوئی۔ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر ایک زمیندار کے لڑکے کو ان نشانیوں کا حامل پایا۔بادشاہ کے کارندوں نے بہت سی دولت دے کر لڑکے کے ماں باپ کو راضی کرلیا اور قاضی نے بھی اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

کہ بادشاہ کی سلامتی کے لیے کسی ایک شخص کا خون جائز ہے۔جلاد نے قتل کرنیکا ارادہ کیا تو

لڑکا آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا اور مسکرانے لگا۔

بادشاہ حیران ہوا کہ موت کو سامنے کھڑا دیکھ کر یہ لڑکا کیوں مسکرایا ہے۔اس حالت میں ہنسنے کیا موقع ہے؟

بادشاہ نے لڑکے کو اپنے قریب بلایا۔اور بے وجہ مسکرانے کا سبب معلوم کیا۔لڑکے نے جواب دیا۔

''اولاد ماں باپ کو پیار کرتی ہے۔دعویٰ قاضی کے آگے لے جاتے ہیں۔اور دادرسی بادشاہ سے چاہتے ہیں جبکہ ماں باپ دولت لے کر میرے خون پر راضی ہو گئے۔قاضی نے میرے قتل کا فتویٰ دے دیا اور بادشاہ نے بھی اچھا ہونا میرے ہلاک ہونے میں دیکھا۔

اب مجھے خدا ہی سے پناہ مل سکتی ہے۔

آگے کروں کس کے جا کے تیری فریاد
مانگوں ہوں تیرے ظلم کی تجھ سے ہی داد

یہ باتیں سن کر بادشاہ کا دل بھر آیا۔اور کہا۔

''ایسے بے گناہ کے خون سے میرا مر جانا ہی بہتر ہے''۔یہ کہہ کر اس لڑکے کے ماتھے کو چوما۔اس کو گود میں لے لیا۔اور بہت سا مال وزر دے کر اسے رخصت کیا۔

تو خدا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی بیماری دور ہو گئی۔اس نے شفا پائی۔

تلقین:۔

حضرت سعدیؒ نے اس حکایت میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی کی جان لینا انسانیت نہیں۔

ایسا قاتل بادشاہ ہونے کی صورت میں دنیا کے قانون سے بچ سکتا ہے لیکن خدائی قانون سے نہیں بچ سکتا۔وہ ضرور اور ضرور سزا پائیگا۔

(حکایات سعدیؒ)

MONTHLY MAGAZINE **Millia** FAISALABAD PAKISTAN
JAMIA MILLIA ISLAMIA
Reg:M # FD-16

MOHALLAH KHALSA COLLEGE FAISALABAD Ph:041-8711569
E-mail: milliafsd@yahoo.com Fax # 041-8502213

میرے دادا مرحوم نے مرزا کی ظاہری شکل و صورت دیکھ کر بتلا دیا تھا کہ یہ شخص عنقریب نہ صرف اسلام بلکہ انسانیت کا دشمن ہو گا۔ میں اس مقدس خاندان کی یادگار ہوں۔ کہ جس نے کشفی طور پر معلوم کر کے حقیقت کا انکشاف فرمایا۔

نبوت کی بحث کس سے کرتے ہو۔ جو سرے سے مرزا (غلام احمد قادیانی) کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ آؤ تم کو یثربی نبوت کا حال سناؤں کہ ریگستان عرب کے لق و دق میں انتہا درجہ کی بے چارگی کے عالم میں علم توحید بلند کرتا ہے۔ اپنے بیگانے دشمن ہو گئے قتل کے منصوبے کیے گئے اور وطن سے نکلنا پڑا۔ بتلاؤ کسی حکومت سے امداد کی درخواست کی کہ مجھے کفار مکہ سے بچاؤ۔ کفار مکہ آئے اور انہوں نے کہا جس چیز کی ضرورت ہے لے لو۔ مگر ہمارے بتوں کو برا نہ کہو۔ ہم تمہارے خدا کو برا نہ کہیں گے۔ اگر کوئی ماڈریٹ ہوتا تو کہتا صورت بہت اچھی ہے چلو مان جاؤ۔ مگر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دو پھر بھی اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ ہے شان نبوت۔ تم ہی بتلاؤ کہ قادیان کی نوزائیدہ نبوت پولیس کے بغیر کبھی دو قدم بھی باہر چلی ہے۔ ساری عمر کی قید نہیں ایک دن بتلا دو کہ فلاں دن قادیان کی نبوت پولیس سے بے نیاز تھی۔ پس یہ نبوت تو پولیس کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے نبی بنا دے۔ پس جس شخص کا کسی پولیس افسر سے دوستانہ ہو نبوت کا دعوی کر دیا کرے۔

یاد رکھو کہ نبی جب کمزور ہوتا ہے تو وہ اپنی بہادری اور شجاعت کا عظیم الشان مظاہرہ دنیا کے سامنے کرتا ہے۔ اور دنیا کی تمام طاغوتی اور مادی قوتیں سرنگوں ہو جاتیں ہیں۔ اور جب وہ طاقتور ہو جاتا ہے تو دشمنوں تک کے لئے رحیم ہوتا ہے۔

اقتباس تقریر
رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ؒ
(۲۳ مارچ ۱۹۳۴ء بمقام قادیان)